Regd. L. No. 7243

Phone. 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

نومبر 1972

طلوعِ اسلام کی سالانہ کنونشن

مورخہ ۲۳ لغایت ۲۶ نومبر کو

منعقد ہو رہی ہے

اس تقریب پر کتابوں میں **خاص رعایت** دی جا رہی ہے

(تفصیل اندر دیکھئے)

شائع کردہ ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر!

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

بدل اشتراک

پاکستان

سالانہ ــــــ دس روپے

غیر ممالک

سالانہ ــــــ ایک پونڈ

ٹیلیفون

۸۰۸۰۰

خط و کتابت

ناظم ادارہ طلوع اسلام - ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور

قیمت فی پرچہ

ایک روپیہ

جلد (۲۵) | نومبر ۱۹۷۲ء | نمبر (۱۱)

فہرست

۱- لمعات ــــــ ۲

۲- روح سر سیدؒ پیکرِ پرویز میں - (چوہدری عطاء اللہ صاحب) ــــــ ۹

۳- مجلسِ مذاکرہ (آخری قسط) - (طلوع اسلام کنونشن ۱۹۷۲ء) ــــــ ۱۷

۴- حقائق و عبر - یہی بات ہم کہیں تو کافر (ایک اور مفتی صاحب) (مفتی صاحب کا ایک آرڈیننس)
(حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ) (خان عبدالغفار خان کا پختونستان)
(پنجاب کی طرف سے خود وضع کردہ موہوم خطرہ) (پاکستان کے "بڑے لوگ")
(گرو دی بانی) (واقعی خبر) ــــــ ۲۸

۵- نقد و نظر - (نظام زکوٰۃ اور جدید معاشی مسائل) (مراقبات) (تحریکِ آزادی) (افکار سیاسی)
(مدارس عربیہ کا جائزہ) ــــــ ۳۳

۶- طلوع اسلام کا پیج فنڈ ــــــ ۴۲

۷- طلوع اسلام نے کیا کچھ نہیں کہا - (محمد اسلم صاحب) ــــــ ۴۳

۸- کراچی میں تقریب یوم آزادی - (آزادی، دو قومی نظریہ اور طلوع اسلام) ــــــ ۵۷

ایڈیٹر محمد خلیل ، ناشر سراج الحق ، مقام اشاعت - ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور ، پرنٹر - شیخ محمد اشرف ، مطبوعہ - اشرف پریس ایبک روڈ لاہور۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

گزشتہ جون میں جب صدر بھٹو مسز اندرا گاندھی کے ساتھ مذاکرات کے لئے ہندوستان تشریف لے جا رہے تھے تو ہم نے طلوعِ اسلام بابت جولائی کے لمعات میں ایک خدشہ کا اظہار کیا تھا۔ تجدیدِ یادداشت کے لئے اس کا دہرا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ہم نے لکھا تھا۔

وہ آجکل سارے ملک کی نگاہیں ان مذاکرات پر مرکوز ہیں جو ۲۸ جون کو صدر بھٹو اور بھارت کی وزیرِ اعظم مسز اندرا گاندھی کے مابین ہونے قرار پائے ہیں۔ ہم تو ان مذاکرات کو چنداں اہمیت نہیں دیتے کیونکہ

ہم جانتے ہیں جو وہ کہیں گے جواب میں

لیکن چونکہ یہ ہماری مستقبل کی تاریخ میں ایک اہم جزو بننے والے ہیں اس لئے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ اس باب میں ہمارے تأثرات بھی صفحۂ قرطاس پر آجائیں اور محفوظ رہیں۔

سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ جس قوم کے نمائندگان کے ساتھ گفت و شنید کے لئے صدر بھٹو انڈیا جا رہے ہیں اس قوم کی ذہنیت کس قسم کی ہے۔ طلوعِ اسلام کنونشن منعقدہ اکتوبر ۱۹۶۵ء میں پرویز صاحب نے ایک خطاب پیش کیا تھا جس کا عنوان تھا ــــ ہندو کیا ہے ــــ اس میں انہوں نے علاوہ دیگر امور، یہ بتایا تھا کہ ہندوؤں کی ساری تاریخ میں ایک سیاسی فلاسفر پیدا ہوا ہے۔ نام تو اس کا چانکیہ تھا لیکن وہ اپنے آپ کو نہایت فخر سے کوٹلیا کہتا تھا۔ اور ہندو بھی اسے اسی لقب سے پکارتے ہیں۔ کوٹلیا کے معنی ہیں مکّار اور فریب کار۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ وہ ذاتِ شریف کیا تھے اور ان کی متبع قوم کی ذہنیت کس قسم کی ہے۔ اس نے اصولِ سیاست پر ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام ہے "ارتھ شاستر"۔ اس میں سیاست کے چند بنیادی اصول دیئے گئے ہیں جو قابلِ غور ہیں۔

پہلا اصول۔ حصولِ اقتدار اور ملک گیری کی ہوس کبھی ٹھنڈی نہ ہونی پائے۔

دوسرا اصول۔ ہمسایہ سلطنتوں سے وہی سلوک روا رکھا جائے جو دشمنوں سے رکھا جاتا ہے۔

تیسرا اصول۔ غیر ہمسایہ سلطنتوں سے دوستانہ تعلقات قائم کئے جائیں۔

چوتھا اصول۔ جن سے دوستی رکھی جائے اس میں بھی ہمیشہ اپنی غرض پیشِ نظر رہے اور مکارانہ سیاست کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے۔

پانچواں اصول۔ دل میں ہمیشہ رقابت کی آگ مشتعل رکھی جائے۔ ہر بہانے سے جنگ کی چنگاریاں سلگائی جاتی رہیں، جنگ میں انتہائی تشدد سے کام لیا جائے۔ خود اپنے شہریوں کے مصائب و آلام کی بھی پروا نہ کی جائے۔

---

[1] یہ خطاب اب ان کی کتاب "قائدِ اعظم کے تصور کا پاکستان" میں شائع ہو گیا ہے۔

چھٹا اصول:۔ دوسرے ملکوں میں مخالفانہ پراپیگنڈہ، تخریبی کارروائیوں اور ذہنی انتشار پیدا کرنے کی مہم جاری رکھی جائے۔
وہاں اپنے آدمی ناجائز طریق سے داخل کر کے ففتھ کالم بنایا جائے اور یہ سب کچھ مسلسل انداز سے کیا جائے۔

ساتواں اصول:۔ رشوت اور دیگر اسی قسم کے ذرائع سے اقتصادی جنگ جاری رکھی جائے اور دوسرے ملکوں کے آدمیوں کو خریدنے کی کوشش کی جائے۔

آٹھواں اصول:۔ امن کے قیام کا خیال تک بھی دل میں نہ لایا جائے۔ خواہ ساری دنیا انہیں اس پر مجبور کیوں نہ کرے۔

یہ ہیں مختصر الفاظ میں سیاست کے وہ اصول جو ان کے ایک قدیم زمانہ کے مہاتما نے انہیں دیئے۔ اس کے بعد زمانہ جدید میں بھی ان کے ہاں ایک مہاتما (گاندھی) پیدا ہوئے جن کے ساتھ قائداعظمؒ کو واسطہ پڑا تھا۔ وہ مہاتما گاندھی کس قسم کے تھے، اس کا اندازہ قائداعظمؒ کے ان الفاظ سے لگایئے جو انہوں نے اسی قسم کے مذاکرات کے تجربہ کے بعد تنگ آکر کہے تھے۔ انہوں نے اگست ۱۹۴۴ء میں ایک جلسہ عام میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ:۔

> ہمیں جس حریف سے پالا پڑا ہے وہ گرگٹ کی طرح اپنا رنگ بدلتا رہتا ہے۔ جب ان کے (یعنی مہاتما گاندھی کے) مفید مطلب ہوتا ہے وہ کہہ دیتے ہیں کہ وہ کسی کے بھی نمائندے نہیں۔ وہ محض انفرادی حیثیت سے گفتگو کر رہے ہیں۔ وہ کانگریس کے چار آنے کے ممبر بھی نہیں۔ اور جب ضرورت ہوتی ہے تو سارے ہندوستان کے واحد نمائندہ بن جاتے ہیں جب اور حربوں سے کام نہیں چلتا تو مرن برت رکھ لیتے ہیں جب کوئی دلیل بن نہیں پڑتی تو "اندرونی آواز" کو بلا لیتے ہیں۔ جو کچھ وہ زبان سے کہتے ہیں ان کا مقصد وہ نہیں ہوتا اور جو ان کا مقصد ہوتا ہے اُسے کبھی زبان پر نہیں لاتے۔ کہئے کہ ایسے شخص سے ہم کس طرح بات کر سکتے ہیں۔ وہ تو ایک چیستان ہیں۔ ایک معمہ ہیں!

اور اب انہی کی "چیلی" سے صدر بھٹو کا واسطہ پڑ رہا ہے ـــ صدر بھٹو! ـــ تیرا اللہ رکھوالا!! "

معاہدہ شملہ کو طے پائے قریب چار ماہ کا عرصہ ہو رہا ہے۔ آپ دیکھئے کہ اس چار ماہ کے عرصہ میں ہندوستان کا رویہ کیا رہا ہے۔ اس معاہدہ کی شق اول یہ تھی کہ توثیق معاہدہ کے بعد تیس دن کے اندر اندر مغربی محاذ سے فریقین کی فوجیں قبل از جنگ کی حدود پر واپس چلی جائیں گی۔ یہ شرط نہایت واضح، غیر مبہم اور غیر مشروط تھی۔ توثیق معاہدہ کی شرط شروع اگست میں پوری ہو گئی تھی۔ اس اعتبار سے فوجوں کی واپسی شروع ستمبر تک مکمل ہو جانی چاہیئے تھی۔ لیکن آج تین ماہ کے بعد بھی فوجیں وہیں کی وہیں ہیں۔ پوچھئے پر جواب ملتا ہے کہ اس تاخیر کا ذمہ دار خود پاکستان ہے۔ پوچھا جاتا ہے کہ وہ کیسے؟ جواب ملتا ہے کہ فوجوں کی واپسی کشمیر کی کنٹرول لائن کے تعین پر موقوف ہے، اور کنٹرول لائن کے تعین میں پاکستان کی طرف سے تاخیر ہو رہی ہے۔ جواب دیا جاتا ہے کہ اول تو معاہدہ شملہ میں کہیں یہ نہیں کہا گیا کہ فوجوں کی واپسی کشمیر کی کنٹرول لائن کے تعین کے ساتھ مشروط تھی اور دوسرے یہ کہ اس لائن کے تعین میں تاخیر خود ہندوستان کی طرف سے کی جا رہی ہے نہ کہ پاکستان کی طرف سے۔ اس کے جواب میں کہا جاتا ہے کہ پاکستان ہندوستان کے ساتھ پُر امن روابط رکھنا ہی نہیں چاہتا اس کے عزائم شروع ہی سے مشکوک چلے آ رہے ہیں۔ فرمایئے! اس کا کیا جواب دیا جائے۔ کنٹرول لائن کے تعین کے سلسلہ میں کیا کچھ ہو رہا ہے اس کا ہمیں علم نہیں، لیکن ایسا نظر آتا ہے کہ بھارت دھاندلی سے پاکستانی علاقے اپنے قبضہ میں لے لینا چاہتا ہے، جب پاکستانی نمائندے اس پر راضی نہیں ہوتے تو وہ گفت و شنید کی کارروائی کو معطل کر دیتا

ہے اور ہمارے محبوس و مقہور، بے کس و بے بس، پابہ زنجیر جنگی قیدیوں کو بھون کر رکھ دیتا ہے تاکہ ہم اس طرح مجبور ہو کر ان کی دھاندلی کے سامنے سرِتسلیم خم کر دیں۔ یہ ہے وہ انداز جس کے مطابق بھارت معاہدہ شملہ پر عمل پیرا ہو رہا ہے۔

بھارت کے عزائم کے متعلق ہمیں کبھی کسی حالت میں بھی کسی غلط فہمی میں نہیں رہنا چاہئے۔ وہ پاکستان کو جداگانہ آزاد مملکت کی حیثیت سے دیکھنا برداشت ہی نہیں کر سکتا۔ وہ اسے کسی نہ کسی طرح ختم کر دینا چاہتا ہے۔ اس کے لئے اس نے دسمبر ۱۹۴۷ء میں پاکستان پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا لیکن فوجی مشورہ اس کے حق میں نہیں تھا اس لئے اسے اس ارادہ کو ملتوی کر دینا پڑا۔ اس کے بعد وہ اٹھارہ برس تک اس کے لئے تیاریاں کرتا رہا اور جب اس کے فوجیوں نے اسے یقین دلایا کہ وہ صبح کو حملہ کر کے شام کو جامِ فتح لاہور کے جم خانہ میں نوش کریں گے تو اس نے بغیر کسی اعلان اور الٹی میٹم کے پاکستان پر دھاوا بول دیا لیکن سرحدوں کی ستیزہ کاری کے بعد اسے معلوم ہو گیا کہ پاکستان کو اس طرح فتح کر لینا آسان نہیں۔ اس کے بعد اس نے اپنی شکست کے اسباب پر غور کیا تو اس کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ جب تک پاکستان میں اندرونی خلفشار پیدا نہ کیا جائے، اسے مغلوب کر لینا ممکن نہیں ہوگا۔ چنانچہ ۱۹۶۵ء کے بعد سے اس نے اپنے اس نئے حربہ پر عمل پیرا ہونا شروع کر دیا اور اس تجربہ کی ابتداء مشرقی پاکستان سے کی۔ دسمبر ۱۹۷۱ء کی جنگ نے یہ ثابت کر دیا کہ ان کا یہ حربہ کامیاب رہا ہے۔ ہمارے اس حصۂ مملکت کو ختم کرنے کے بعد بھارت نے اپنی توجہ کا رخ مغربی پاکستان کی طرف موڑا اور اپنی اسی مجرب چال (STRATEGY) کو یہاں بڑھانا شروع کر دیا۔ اس حصۂ مملکت میں بھارت کو اندرونی خلفشار پیدا کرنے کے لئے زیادہ دشواری پیش نہیں آ رہی۔ ہمیں اس حقیقت کو کبھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ جن لوگوں نے تقسیم ہند سے پہلے مطالبۂ پاکستان کی مخالفت کی تھی، انہوں نے اب تک پاکستان کے علیحدہ وجود کو دل سے پسند نہیں کیا۔ اس میں علاوہ دیگر اسباب، ایک گہرا نفسیاتی جذبہ بھی کارفرما ہے۔ انسان (بجز اس کے کہ وہ بڑے بلند کردار کا حامل ہو) شکستِ پندار کے زخم کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ اس سے اس کے دل میں انتقام کے جذبات پرورش پاتے اور نفرت کے پہلو ابھرتے رہتے ہیں۔ یہ لوگ اس زمانے میں کہا کرتے تھے کہ پاکستان ایک علیحدہ مملکت کی حیثیت میں اپنے وجود کو قائم نہیں رکھ سکے گا۔ تشکیلِ پاکستان کے بعد ان کی مسلسل کوشش رہی ہے کہ کسی نہ کسی طرح پاکستان کے تجربہ کو ناکام بنا دیا جائے تاکہ وہ یہ کہہ کر اپنا آتشِ انتقام کو فرو کر سکیں کہ — کیوں! ہم نہ کہتے تھے؟ — قیامِ پاکستان کے خلاف ان کے دل میں کس قدر نفرت تھی اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ جب انگریز اور ہندو دونوں تقسیم پر رضامند ہو گئے تھے، تو خان عبدالغفار خان نے، جون ۱۹۴۷ء میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں، اس کے خلاف دہائی مچا دی تھی اور ہندوؤں کو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ تم نے ہماری وفا شعاری کا یہ صلہ دیا ہے کہ ہمیں بھیڑیوں کے آگے ڈال رہے ہو! سوچئے کہ جو شخص قیامِ پاکستان کے حامیوں کو "بھیڑیئے" قرار دے۔ ان کے لئے اس کے دل میں کبھی محبت اور رفاقت کے جذبات پیدا ہو سکتے ہیں؟ ہندو نے خان صاحب کے اس طعن سے مجبور ہو کر سرحد میں ریفرنڈم کی تجویز پیش کر دی۔ لیکن باچا خان نے یہ شرط بڑھا دی کہ ریفرنڈم اس امر کے تصفیہ کے لئے ہوگا کہ سرحد کے لوگ پاکستان کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں یا اپنی آزاد مملکت قائم کرنا۔ اور جب ان کی یہ شرط تسلیم نہ کی گئی تو انہوں نے ریفرنڈم کا بائیکاٹ کر دیا۔ اس سلسلہ میں آپ باچا خان صاحب کی ان چٹھیوں کو دیکھئے جو انہوں نے جون، جولائی ۱۹۴۷ء میں مختلف مشاہیر کو لکھی تھیں (اور جو چند صفحات آگے چل کر حقائق و عبر کے عنوان کے تحت اسی اشاعت میں آپ کے سامنے آ جائیں گی)۔ ان کے علاوہ، تحریکِ پاکستان کے مخالفین میں نیشنلسٹ علماء کا گروہ بھی پیش پیش تھا۔

ان کے سرخیل مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) تھے۔ ان کے دل میں مطالبۂ پاکستان کے خلاف کس قدر نفرت تھی اس کا اندازہ ان کی اس قلمی اور لسانی جنگ سے لگ سکتا ہے جو علامہ اقبالؒ کے ساتھ ہوئی تھی۔ پاکستان میں مفتی محمود اور ان کے ہمنوا علماء اسی گروہ سے متعلق ہیں۔ مولانا حسین احمد (مرحوم) اسلام کے نام پر حاصل کی جانے والی مملکت کے مقابلہ میں ہندو کی پیش کردہ سیکولر حکومت کے ساتھ رفاقت میں فخر محسوس کرتے تھے۔ مفتی محمود صاحب اس نیپ کے اشتراک سے حکومت قائم کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں جس کے منشور میں سیکولر حکومت کی شق موجود ہے۔ سندھ میں مسٹر سید ۱۹۴۶ء تک تحریک پاکستان کے سرکردہ ہمنواؤں میں سے تھے۔ لیکن ۱۹۴۶ء میں جو انہوں نے مسلم لیگ سے علیحدگی اختیار کی تو اس کی مخالفت میں آگے ہی آگے بڑھتے چلے گئے۔ تشکیل پاکستان کے بعد نیشنل عوامی پارٹی (نیپ) کے قیام کے لئے انہوں نے نمایاں کردار ادا کیا۔ اب وہ سندھ متحدہ محاذ کے سربراہ ہیں جن کا مقصد وحید پاکستان کی مخالفت اور سندھ کی علیحدگی ہے۔ ان کے علاوہ جماعت اسلامی کے امیر سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی تحریک پاکستان کی مخالفت اظہر من الشمس ہے۔ انہیں اس تحریک کی کامیابی سے کس قدر کوفت پہنچی تھی اس کا اندازہ اس ایک بات سے لگائیے کہ تقسیم ہند کے بعد وہ پناہ لینے کے لئے ہندوستان سے بھاگ کر اسی پاکستان میں آ گئے جس کی انہوں نے اس شدت سے مخالفت کی تھی۔ پاکستان نے انہیں خندہ پیشانی سے پناہ دی۔ لیکن انہوں نے اپنے رسالہ (ترجمان القرآن) کی پہلی پاکستانی اشاعت (بابت جون ۱۹۴۸ء) میں پاکستانی سیاست پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ۔

> یہ بحث ان لوگوں کا منہ کالا کر دینے والی ہے جنہوں نے پچھلے ربع صدی میں ہماری سیاسی تحریکوں کی قیادت فرمائی ہے۔

اور اگست ۱۹۴۸ء کی اشاعت میں ارکان و اعیان تحریک پاکستان کو ہر قسم کے طعن و تشنیع کا ہدف بنانے کے بعد لکھا۔

> اس پورے گروہ میں سے ایک کو بھی نہ نکلا جو بازی کھو دینے کے بعد سر دے سکتا۔ ساری جماعت بازیگروں سے بھری پڑی تھی جنہوں نے عجیب عجیب کلا بازیاں کھا کر دنیا کو اپنی بودی سیرت اور کھوکھلے اخلاق کا تماشا دکھایا اور اس قوم کی رہی سہی عزت بھی مٹا دی جس کے وہ نمائندہ بنے ہوئے تھے۔

اس کے بعد آج تک اس جماعت کے سامنے سوائے اس کے کہ اسلام کے نام پر ملک میں فساد برپا کیا جائے کوئی پروگرام نہیں رہا۔

پاکستان میں اندرونی خلفشار برپا کرنے کے لئے یہی عناصر کچھ کم نہ تھے کہ ان میں ایک اور کا اضافہ بھی ہو گیا۔ تشکیل پاکستان کے بعد قائد اعظمؒ نے قوم کو کمیونسٹوں کی تخریب پسندی سے متنبہ کیا تھا۔ اگر وہ ایسی تنبیہ نہ بھی کرتے تو بھی کمیونسٹوں کی پاکستان دشمنی کے سمجھنے کے لئے کسی افلاطون کے دماغ کی ضرورت نہیں۔ پاکستان اس لئے حاصل کیا گیا تھا کہ یہاں اسلامی نظام کا احیاء ہو سکے، اور کمیونسٹ اسلام کی اصل و بنیاد کے خلاف ہیں۔ لہٰذا وہ اس قسم کی مملکت کے وجود کو کس طرح برداشت کر سکتے ہیں، جو اسلام کے احیاء کے لئے حاصل کی گئی ہو۔ پاکستان میں ان حضرات کی سرگرمیاں سال گذشتہ تک تو خوابیدہ سی رہیں لیکن جب بھارت اور روس کا باہمی معاہدہ ہوا تو یہ ابھر کر سامنے آ گئے۔ اس لئے کہ پاکستان میں اندرونی خلفشار بھارت اور روس دونوں کے مفاد میں ہے۔

یہ تمام پاکستان دشمن عناصر پاکستان میں اندرونی خلفشار برپا کرنے کے لئے بڑی سرگرمی سے مصروف عمل ہیں۔ پروپیگنڈہ تخریبی عناصر کا موثر ترین حربہ ہوتا ہے۔ سو اس میں یہ تیز خرامی سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ ایک طرف ان کی ٹیکنیک یہ ہے کہ جن

بنیادوں پر مملکتِ پاکستان کا جداگانہ وجود عمل میں آیا تھا انہیں مسمار کر دیا جائے اور اس طرح قوم کے دل میں یہ خیال جاگزیں کر دیا جائے کہ ہمارا مطالبۂ پاکستان محکم بنیادوں پر استوار نہیں تھا۔ "تشکیلِ بنگلہ دیش سے دو قومی نظریہ باطل قرار پاگیا ہے"۔ "مذہب کی بنیاد پر ایک قوم کی تشکیل کا تجربہ ناکام ہو گیا ہے"۔ "پاکستان کی پچیس سالہ تاریخ نے ثابت کر دیا ہے کہ اس زمانے میں مذہبی حکومتیں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتیں"۔ یہ اور اسی قسم کے دیگر سلوگنز سے قوم کے دل سے نظریۂ پاکستان سے متعلق وہ یقینِ محکم سلب کیا جا رہا ہے جو اس مملکت کی حفاظت کے لئے ناقابلِ تسخیر حصار تھا۔ ان نظریات کے بجائے چار قومیتوں کا تصور، سیکولر نظامِ حکومت۔ ایسی صوبائی خود مختاری جس کا اگلا اور آسان ترین قدم علیحدگی ہوتا ہے۔ اس قسم کے تصورات کو اس سرعت اور شدت کے ساتھ پھیلایا جا رہا ہے کہ یہ ملک کی ساری فضا پر پوری طرح چھا گئے ہیں۔ اس مسلسل اور سائنٹفک انداز کے پراپیگنڈہ کا نتیجہ ہے کہ قوم بُری طرح سے مایوسی اور بددلی کا شکار ہو گئی ہے۔ اس کے دل میں پاکستان کے مستقبل کے متعلق طرح طرح کے وساوس پیدا ہو رہے ہیں۔ قوم کے دل و دماغ میں اس قسم کے خدشات اور وساوس پیدا کرنے کے بعد یہ دھمکیاں بھی دی جا رہی ہیں کہ اگر ہمارے مطالبات تسلیم نہ کئے گئے تو ہم یہ کر دیں گے اور وہ کر دیں گے۔ خان عبدالولی خان صاحب لندن بیٹھے الٹی میٹم دے رہے ہیں کہ اگر ہماری منشاء کے مطابق صوبجاتی خود مختاری نہ دی گئی تو ہم ملک گیر تحریک چلا دینگے — وہ یہ نعرہ بلند کرتے ہیں اور اس کی تائید بلوچستان اور سندھ سے ہوتی ہے۔ جماعتِ اسلامی کا اس باب میں اپنا انداز ہے۔ مودودی صاحب ایک طرف یہ کہتے ہیں کہ قرآن و سنت کی بنا پر کوئی ایسا ضابطۂ قوانین مرتب نہیں کیا جا سکتا جو تمام فرقوں کے نزدیک متفقہ طور پر قابلِ قبول ہو' اور دوسری طرف' امیر جماعتِ اسلامی' صوبہ پنجاب، اسعد گیلانی صاحب للکارتے ہیں کہ:

> آئینی مسائل میں سب سے بڑا مسئلہ ملک میں اسلامی نظام اور قرآن و سنت پر مبنی قوانین کا اجراء اور اسلامی سماجی ڈھانچے کی تشکیل کا مسئلہ ہے۔ ہم اس مرحلہ پر یہ بات واضح کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ اگر ملک کے آئین میں اسلامی قوانینِ شریعت کے اجراء اور اسلامی معاشرہ کی تشکیل کی ضمانت نہ دی گئی تو جماعتِ اسلامی فی الحقیقت ملک بھر میں ایسی تحریک چلائے گی جس کی لہر خیبر سے کراچی تک نظر آئے گی اور جو لوگ اسلام کو فرسودہ نظام کہتے ہیں انہیں اس عوامی تحریک کے آگے سرنگوں ہونا پڑے گا۔
>
> (نوائے وقت - ۱۶ اکتوبر ۱۹۷۲ء)

یہ ہے وہ فضا جو ملک میں پیدا کی جا رہی ہے۔ ہمارا اندازہ یہ ہے کہ بھارت (اور روس) اس کا انتظار کر رہے ہیں کہ جب یہاں اندرونی خلفشار اپنی شدت کو پہنچ جائے تو پھر اس حصۂ ملک پر اسی طرح دھاوا بول دیا جائے جس طرح انہوں نے مشرقی پاکستان میں کیا تھا۔ معاہدہ شملہ۔ جنگی قیدیوں کے مسئلہ میں لیت و لعل۔ بنگلہ دیش کو تسلیم کرانے کا مطالبہ' وغیرہ اس انتظار کے وقفہ کو گذارنے کے حربے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ کیا ملک اس خطرہ سے بچ سکتا ہے اور اگر بچ سکتا ہے تو اس کے لئے کیا کرنا چاہیئے۔ ہمارا جواب یہ ہے کہ ملک اس خطرہ سے بچ سکتا ہے اور یقینی طور پر بچ سکتا ہے بشرطیکہ اس میں اندرونی خلفشار نہ پیدا ہونے دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس مقصد کے لئے سب سے پہلے نگاہیں حکومت کی طرف اٹھیں گی۔

موجودہ حکومت کے متعلق ہمارے موقف سے قارئین واقف ہیں۔ ہم نہ تو پیپلز پارٹی کے معتقدین میں سے ہیں۔ اور

نہ ہی اس کی حکومت کو مثالی یا خرابیوں سے مبرّیٰ سمجھتے ہیں۔ بایں ہمہ ہم شروع سے یہ کہتے چلے آ رہے ہیں کہ اس حکومت کا مستحکم رہنا ملک کے لئے ازبس ضروری ہے۔ آئے دن حکومتیں بدلنا، عام حالات میں بھی بڑی سے بڑی محکم مملکت کو کمزور کر دیتا ہے لیکن جن حالات سے ہم دوچار ہیں، ان میں اس قسم کی آئے دن کی تبدیلیاں مملکت کو ختم کر دینے کا موجب بن سکتی ہیں؛ لہٰذا اس حکومت کا استحکام ہر بہی خواہِ مملکت کا فریضہ ہونا چاہیئے۔ لیکن یہ فریضہ، باشندگانِ مملکت کے علاوہ، خود اربابِ حکومت پر بدرجۂ اتم عاید ہوتا ہے۔ یعنی اربابِ حکومت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ ایسی غلطیاں نہ کریں جن سے ان کی حکومت کمزور ہو جائے۔ لیکن ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ان کی طرف سے پے در پے ایسی غلطیاں سرزد ہو رہی ہیں جن کی وجہ سے حکومت کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ ہم، اربابِ حکومت کی اس قسم کی غلطیوں کی نشاندہی کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اس کا جذبۂ محرکہ بھی یہی ہے کہ وہ اپنی اصلاح کر لیں تاکہ ان کی حکومت کمزور نہ ہونے پائے۔ یاد رکھیئے۔ مخالفین کی اپنی قوت اتنی زیادہ نہیں ہوتی۔ وہ فریقِ مقابل کی غلطیوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ہمیں ڈر یہ ہے کہ اگر اربابِ حکومت نے اپنی اصلاح نہ کی اور ان سے اسی طرح غلطیاں سرزد ہوتی رہیں، تو مخالفین کی قوت میں اسی نسبت سے اضافہ ہوتا چلا جائے گا اور جو سازش ملک میں اس وقت ہو رہی ہے وہ بڑے تباہ کن نتائج پر منتج ہو گی۔

ہم نے اوپر بتایا ہے کہ سازش یہ ہے کہ ملک میں اس وقت خلفشار اور انتشار برپا کیا جائے۔ خلفشار اور انتشار اسی صورت میں پیدا ہوتا ہے جب باشندگانِ مملکت میں سکون اور اطمینان نہ رہے۔ عدمِ سکون اور فقدانِ اطمینان کا لازمی نتیجہ عدمِ اعتماد ہوتا ہے۔ جوں جوں قوم کے دل سے حکومت کا اعتماد اٹھتا جاتا ہے، خلفشار کے لئے فضا سازگار ہوتی جاتی ہے۔ غلط بیں اور غلط رَو حکومتیں، اس عدمِ اعتماد سے جھلا کر، تشدد اختیار کرتی ہیں۔ تشدد کا نتیجہ خوف و ہراس ہوتا ہے اور خوف و ہراس سے رہا سہا اعتماد بھی ختم ہو جاتا ہے۔ غلط اندیش حکومتیں سمجھتی ہیں کہ ہم نے تشدد اور خوف و ہراس سے فتنہ کو فرو کر دیا ہے لیکن اس سے فتنہ فرو نہیں ہوتا۔ اس کی جڑیں اور گہرائی میں چلی جاتی ہیں اور اس کا ردِّ عمل اس شدت سے نمودار ہوتا ہے کہ وہ سیلاب کسی کے روکے نہیں رُک سکتا

اعتماد حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ افرادِ مملکت کو اس امر کا پورا پورا یقین ہو کہ ان کی عزتِ نفس (SELF-RESPECT) محفوظ ہے۔ یہ بڑی بنیادی شرط ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ روٹی، کپڑا، اور دیگر طبعی ضروریات، انسانی زندگی کے لئے ضروری ہیں، لیکن شریف انسان کے نزدیک اس کی عزتِ نفس کی قیمت، سامانِ زیست سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ اگر آپ کسی مفلوک الحال شریف انسان کو روٹی، کپڑا ہی نہیں، کثیر دولت بھی دے دیں، لیکن اسے ذلیل کر دیں، تو اول تو وہ آپ کی اس بخشش کو قبول ہی نہیں کرے گا۔ لیکن اگر اسے کسی وجہ سے اسے قبول کرنا بھی پڑے تو اس کے دل میں آپ کا وقار اور اعتماد قائم نہیں ہو سکیگا۔ اس کے برعکس، اگر آپ اس کی مدد نہ بھی کر سکیں لیکن اس کی عزتِ نفس کو ٹھیس نہ لگنے دیں تو اس کے دل میں آپ کا احترام باقی رہیگا۔ اسی لئے قرآنِ کریم نے اس امداد کی سخت مذمت کی ہے جس سے دوسرے کی عزتِ نفس پر حرف آئے۔ اس نے کہا ہے کہ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّ مَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى (۲/۲۶۳) شرافت سے معذرت کر دینا اس امداد سے کہیں بہتر ہے جس سے دوسرے کی ذلت ہوتی ہو۔ اور اگر صورت یہ ہو کہ اس کی امداد تو کی نہ جائے لیکن اسے ذلیل کر دیا جائے تو اس کا ردِّ عمل جس قدر شدید ہو سکتا ہے ظاہر ہے۔

اعتماد حاصل کرنے کی دوسری شرط یہ ہے کہ قوم سے جو وعدہ کیا جائے اسے پورا کیا جائے اگر کبھی بعد میں حالات

ایسے پیدا ہوجائیں جن کا اندازہ پہلے نہیں کیا جاسکتا تھا جن کی وجہ سے اس وعدہ کا ایفا مشکل ہوگیا ہے تو صورتِ حال کو ملک کے سامنے ایسی وضاحت اور مدلل طریق سے رکھ دیا جائے کہ لوگوں کو اطمینان ہوجائے کہ یہ وعدہ شکنی نہیں بلکہ واقعی معذوری اور مجبوری ہے۔

اعتماد حاصل کرنے کی تیسری بنیادی شرط یہ ہے کہ کسی کے خلاف ذاتی دشمنی یا اختلاف کی بنا پر کوئی کاروائی نہ کی جائے۔ اربابِ حکومت کے پاس بڑی وسیع قوت ہوتی ہے اور افرادِ مملکت ان کے مقابلہ میں بے بس ہوتے ہیں۔ اگر ان بے بسوں کے خلاف طاقت کا ناجائز استعمال کیا جائے تو اس سے آپ ان کے جسموں کو تو کچل سکتے ہیں لیکن ان کے اندر سے روحِ بغاوت اس قوت اور شدت سے ابھرتی ہے جو سب کچھ تہس نہس کرکے رکھ دیتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس کے ہاتھ میں قوت استعمال کرنے کی ذمہ داریاں آجائیں، ان کے ذہن سے ذاتی دوستی اور ذاتی دشمنی کا خیال تک محو ہوجانا چاہیئے۔ ان کے نزدیک دوست اور دشمن اپنے اور بیگانے کا ایک ہی معیار ہونا چاہیئے۔ اور وہ یہ کہ جو شخص مملکت کا دوست ہو وہ ان کا دوست قرار پائے اور جو مملکت کا دشمن ہو وہ ان کا دشمن ٹھہرے۔ ہمیں تسلیم ہے کہ اربابِ اختیار کے لئے بعض اوقات، بعض افراد کا مواخذہ کرنا (خود مفادِ مملکت کی خاطر) ضروری ہوجاتا ہے۔ ایسی صورت میں یہ اشد ضروری ہے کہ حکومت اپنے اس اقدام کی وجوہ ایسی وضاحت سے ملک کے سامنے رکھے کہ ہر شخص اس کے جواز کا قائل ہوجائے۔ اس سے حکومت کا اعتماد قائم رہیگا اور ملک دشمن عناصر کے چہرے بے نقاب ہوجائیں گے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو اس کا عام تاثر یہ ہوجاتا ہے کہ جن کا مواخذہ کیا جاتا ہے انہیں لوگ بے گناہ اور مظلوم خیال کرتے ہیں اور حکومت کو جابر اور ظالم۔ اس سے بھی حکومت کا اعتماد دلوں سے اٹھ جاتا ہے۔

بنابریں ہم اربابِ حکومت کی خدمت میں با ادب لیکن بزور درخواست کریں گے کہ وہ قوم کے دل میں اپنے اس اعتماد کو بحال کرنے کی پوری پوری کوشش کریں جو اس وقت گرتا جارہا ہے۔ اگر یہ اعتماد بحال ہوگیا تو پھر نہ بیرونی قوتوں کی کوئی قوت کامیاب ہوسکے گی اور نہ ہی اندرونی تخریبی عناصر ملک میں انتشار پیدا کرسکیں گے۔ اس کے ساتھ قوم سے ہماری گذارش ہے کہ ملک بڑے ہی نازک حالات سے گذر رہا ہے۔ سازشی عناصر یہاں انتشار پھیلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس مقصد کے لئے وہ ایسے اسباب پیدا کرینگے جن سے آپ مشتعل ہوجائیں۔ آپ کے تدبر اور احترامِ مفادِ مملکت کا تقاضا یہ ہے کہ کچھ بھی ہو آپ مشتعل نہ ہوں۔ اس سے ان سب کے مذموم عزائم خاک میں مل جائیں گے۔ جہاں تک وابستگانِ تحریکِ طلوعِ اسلام کا تعلق ہے وہ پہلے ہی اس نکتہ کو سمجھے ہوئے ہیں کہ فساد اور انتشار سے ملک کی تباہی ہوجاتی ہے۔ ایک حسنِ اتفاق سے نومبر کے آخری ہفتہ میں (۲۳ تا ۲۶) لاہور میں طلوعِ اسلام کنونشن منعقد ہو رہا ہے اس میں مزید وضاحت سے ان کے ذہن نشین کرا دیا جائے گا کہ ملک میں امن قائم رکھنے کے سلسلہ میں ان کی ذمہ داریاں کیا ہیں۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ ہمیں ہر خارجی اور داخلی شر سے محفوظ رکھے اور یہ مملکت سالم اور مستحکم رہے۔

(پرویز)

مکرر۔ آخری خبر یہ آئی ہے کہ کشمیر میں کنٹرول لائن کے تعین کا فیصلہ ہوگیا ہے۔ اب دیکھئے "سرزمین کوٹلیا" کی طرف سے نئی رکاوٹ کیا پیش کی جاتی ہے۔

(۲۰ اکتوبر ۱۹۶۲ء)

(پرویز)

چوہدری عطاء اللہ ایڈووکیٹ
ساہیوال

روحِ سرسید پیکرِ پرویز میں

(طلوعِ اسلام کنونشن ۱۹۷۲ء میں پڑھا گیا)

نژادِ نو کی تعلیم کا مسئلہ جب بھی عنوانِ گفتگو ہوگا، ہم اپنے اذہان میں ایک مضطرب و بیقرار سا نقش اُبھرتا ہوا پائیں گے۔ اور وہ نقش ایک کوہ وقار شبیہ کی صورت اختیار کر جائے گا اور شبیہ ہوگی اُس رجلِ عظیم کی جسے ہم سب سرسید احمد خان کے نامِ نامی سے بخوبی جانتے اور پہچانتے ہیں۔

سرسید سے بڑھ کر بامقصد تعلیم کا پُرجوش حامی اور ماہر برِعظیم میں نہیں گزرا۔ اور اگرچہ سرسید کو شہرتِ دوام تو علومِ جدیدہ کی تعلیم کی حمایت ہی کے سبب ملی تاہم ندرتِ فکر اور حسنِ عمل کا جو دستاویزی ثبوت سیرتِ سرسید کی صورت میں ہمارے سامنے آیا وہ خوبی و رعنائی کے اور بھی کثیر پہلو رکھتا ہے۔ بلکہ سچ بات تو یہ ہے کہ ہماری قومی زندگی کا کوئی بھی صحت مند گوشہ ایسا نہیں ہے جس پر فکرِ سرسید اور عملِ سرسید کی چھاپ نہ لگی ہو۔ بقولِ فیض ؎

شمعِ نظر، خیال کے انجم، جگر کے داغ
جتنے چراغ ہیں تری محفل سے آئے ہیں

فکر و عمل کی جو راہیں سرسید نے استوار کیں انہی راہوں پر چلتے ہوئے ہم پاکستان کی منزل تک پہنچ پائے تھے۔ سرسید نہ ہوتے تو برِعظیم کے مسلمانوں کا انجام بھی ہسپانیہ کے مسلمانوں سے مختلف نہ ہوتا۔

سرسید کا ظہور برِعظیم میں ہماری تاریخ کے اُس انتہائی نازک دور میں ہوا جبکہ ہمارا ملی انحطاط حدِ آخر کو چھو رہا تھا اور اس وسیع و عریض خطۂ زمین پر صدیوں تک نہایت جاہ و جلال سے حکومت کرنے کے بعد مسلمان اپنی بساطِ سیاست ایک ایسی قوم کے ہاتھوں لٹوا چکا تھا جو قوم یہاں سے سات ہزار میل دُور بستی ہے۔ ۱۸۵۷ء کے المناک سانحہ کے بعد ہندو اور انگریز کی ملی بھگت نے مسلمانوں پر کشادگی کی تمام راہیں مسدود کر دی تھیں اور کشورِ ہندوستان میں مسلمان نام رہ گیا تھا بے بسی و بے چارگی، مفلسی و ناداری، بے علمی اور جہالت کا۔ ایسے میں جن سے راہنمائی پانے کی توقع تھی اُن سے بجز اس کے کچھ نہ بن آیا کہ گھروں میں معتکف ہو کر بیٹھ رہے اور قوم کی شکستہ ناؤ کو یاس و ناامیدی کی موجوں کے سپرد کر دیا۔ بپھرے ہوئے حالات کا سامنا کرنے کا کسی میں حوصلہ نہ تھا۔ ابتداءً میں سرسید پر بھی دل شکستگی نے غلبہ پا لیا اور یہ محسوس کرتے ہوئے کہ مسلمان کی حیثیت سے ہندوستان میں عزت و آبرو کی زندگی بسر کرنا اب ممکن نہ رہا تھا، انہوں نے یہاں سے ہجرت کر کے مصر جا بسنے کی ٹھان لی۔ ہماری خوش قسمتی تھی کہ سرسید نے ارادہ ترکِ وطن کو جامۂ عمل نہ پہنایا تھا کہ اس پر مزید غور کرنے پر انہیں

خود غرضی اور مفادِ ملت سے بے تعلقی کا پہلو دکھائی دیا۔ سرسید کے دلِ دردمند پر اس سے ایک کاری ضرب لگی۔ ان کے فکرِ غیور کو گوارا نہ ہوا کہ قوم کو تباہی کی حالت میں چھوڑ کر خود کسی گوشۂ عافیت میں جا بیٹھیں۔ ہندوستان سے ہجرت کر جانے کا فیصلہ بدل دیا گیا۔ اور سرسید نے اس بات کا پختہ ارادہ کر لیا کہ قوم کی مصیبت میں وہ برابر کے شریک رہیں گے اور جو افتاد آپڑی تھی اس کے دور کرنے میں اپنی پوری توانائی اور کوشش صرف کر دیں گے۔

کشتیٔ قوم کو گردابِ بلا سے سالم و ثابت نکال لے جانے کی تین ممکنہ صورتیں سرسید کے سامنے تھیں۔ اوّل انگریز کے خلاف مسلح جہاد۔ دوم غیر ملکی حکمرانوں سے عدم تعاون اور سوم حکومتِ وقت سے باوقار تعاون۔ سرسید نے عمیق غور و فکر کے بعد اس وقت کے خصوصی حالات کے پیشِ نظر وقتی طور پر تعاون کی راہ اختیار کی اور بعد میں رونما ہونے والے واقعات نے ثابت کر دیا کہ سرسید کا فیصلہ بہمہ وجوہ صحیح اور درست تھا۔

۱۸۵۷ء کے سانحہ میں ہماری عسکری قوت پر ایسی ضرب کاری لگ چکی تھی اور اس کی یوں بیخکنی ہو چکی تھی کہ فوری طور پر اس کی دوبارہ ترتیب و تنظیم ممکن نہ تھی۔ عدمِ تعاون کی راہ بدیں وجہ ناقابلِ عمل تھی کہ ہندوستان میں مسلمان کے علاوہ ایک اور قوم بھی آباد تھی جسے مسلمانوں پر عددی تفوق حاصل تھا اور جو اپنے روایتی پُرفریب عجز و انکسار کے ساتھ غیر ملکی نئے آقاؤں کے احکام کی بجا آوری میں ہمہ تن مصروف ہو چکی تھی۔ اس صورتِ حالات میں سرسید کے لئے بھی تعاون کی راہ اختیار کئے بغیر چارہ نہ تھا تاہم اس نوع کے تعاون کو سرسید کی مستقل سیاسی پالیسی بھی نہیں ٹھہرایا جا سکتا بلکہ یہ ایک عارضی اور وقتی طریق کار تھا جسے کسی وقت ترک کیا جا سکتا تھا۔ اس کی واضح تائید سر ولیم ہنٹر کے ایک سوال میں سرسید کی جانب سے دیئے گئے جواب سے بخوبی ہوتی ہے۔ ولیم ہنٹر کا سوال یہ تھا "اے علماء و محققانِ شرعِ اسلام تمہاری اس معاملہ میں کیا رائے ہے کہ اگر کوئی مسلمان بادشاہ ہندوستان پر ایسے وقت میں حملہ کرے جبکہ وہ انگریزوں کے قبضہ میں ہو تو اس ملک کے مسلمانوں کو انگریزی امان ترک کرنی اور غنیم کو مدد دینی جائز ہے یا نہیں؟" سرسید کا جواب یہ تھا کہ "میں نہیں کہہ سکتا کہ آئندہ کوئی مسلمان یا کوئی اور بادشاہ ہندوستان پر حملہ کرے تو اس صورت میں باعتبارِ عمل درآمد کے ٹھیک ٹھیک مسلمان کیا کریں گے۔ کیونکہ وہ شخص درحقیقت نہایت دلیر ہے جو اپنے دلی دوستوں اور رشتہ داروں کے سوا عام شخصوں کی طرف سے بھی کچھ جواب دے۔ بلکہ میری دانست میں تو شاید رشتہ داروں اور دوستوں کی طرف سے بھی کچھ جواب دینا مشکل ہے چنانچہ جو لڑائیاں ہندوستان میں ہوئی ہیں ان میں باپ بیٹوں سے اور بھائی بھائی سے لڑے تھے۔ پس کوئی شخص یہ بات نہیں کہہ سکتا کہ کسی بڑے ملکی ہنگامہ میں کل قوم کا کیا حال ہوگا۔ میں یقین کرتا ہوں کہ ایسی حالت میں مسلمان وہی کریں گے جو ان کی پولیٹیکل حالت ان سے کرائے گی۔" ملاحظہ فرمایا آپ نے سرسید کس خوبصورتی سے اپنے جواب میں بین السطور کہہ گئے ہیں کہ اگر داؤ لگا تو مسلمان انگریز کو ملک سے نکال باہر کرنے سے دریغ بھی نہ کریں گے۔

بقول مولانا محمد علی جوہرؔ سرسید نے حکومت سے تعاون کی راہ اس لئے اختیار کی تھی کہ حکومت علیگڑھ میں قیام کالج اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی راہ میں حائل نہ ہو۔ یہ بات اب کوئی راز نہیں ہے کہ سرسید نے تعلیم میں مسلمان کے کھوئے ہوئے وقار اور اس کی لٹی ہوئی عظمت کو بحال کرنے اور پھر سے پا لینے کے لئے ایک طویل المدت منصوبہ بنایا تھا جس کا نقطۂ آغاز علیگڑھ میں کالج کا قیام تھا جہاں نونہالانِ قوم کی تعلیم و تربیت کا اہتمام اس انداز سے کیا جانا مقصود تھا کہ وہ اس سہ جماعتی کشمکش میں جو مستقبل میں ہندو، انگریز اور مسلمان کے درمیان سیاسی جنگ کی صورت اختیار کرنے والی تھی۔

ملت کی سپاہ کے فرائض سرانجام دے سکیں۔ اس کے لئے مسلمان کے الگ ملی تشخص کا تحفظ اور طلباء میں صحت مند اسلامی عصبیت کا فروغ ازبس ضروری تھا۔ سیاسیاتِ ہند میں فروغ پانے والے دو قومی نظریئے نے علیگڈھ ہی میں جنم لیا۔ اس ضمن میں قائداعظم کے سوانح نگار ہیکٹر بالیتھو کے یہ الفاظ بڑے پُرمعنی اور حقیقت کشا ہیں: "اگر محمد علی جناح ۱۸۹۲ء میں حصولِ تعلیم کے لئے سمندر پار انگلستان جاتے اور لنکنز ان میں داخلہ لینے کی بجائے علیگڑھ کا رُخ کرتے تو دو قومی نظریہ کی حقیقت ان پر کہیں پہلے منکشف ہو جاتی۔ علیگڑھ میں وہ ابتدائی دور کے دانشوروں کی صف میں جگہ پاتے اور اوائل عمر میں ہی وہ سرسید کی ان پیش گوئیوں پر ایمان لے آتے جن پر انہیں آخر عمر میں جا کر یقین آیا۔"

اگرچہ سرسید نے اپنی زندگی میں سیاسی ہنگامہ آفرینیوں سے اجتناب ہی کیا لیکن حکومت کی چیرہ دستیوں سے کبھی صرفِ نظر بھی نہ کیا بلکہ ان کو بے دریغ ہدفِ تنقید بنایا۔ اسبابِ بغاوتِ ہند لکھ کر سرسید نے جس جرأت اور دلیری کا اظہار کیا اُس دور میں کبھی اور سے اس کی توقع نہ کی جا سکتی تھی۔ حکمران قوم کے بعض افراد سرسید کی اس بے باکی سے اس قدر برافروختہ ہوئے کہ انہوں نے سرسید پر بغاوت کا مقدمہ قائم کرنے کا پُرزور مطالبہ کیا جو بوجوہ پورا نہ ہو سکا۔ سرسید کی تحریر کی خوبی یہ تھی کہ اس میں صرف حقائق پیش کئے جاتے اور ان سے نتائج کے برآمد کرنے میں جذبات سے نہیں بلکہ دلیل و برہان سے کام لیا جاتا۔ اور یوں وہ سخت سے سخت بات بھی اس حسنِ کارانہ انداز میں کہہ جاتے کہ اس پر گرفت نہ ہو سکتی۔ تاہم دور بین نگاہیں بھانپ چکی تھیں کہ سرسید کی تحریر و تقریر کی زد کہاں پڑ رہی ہے۔ علیگڑھ میں کالج کے قیام سے مقصود کیا تھا اور جس نہج و اسلوب سے اس درسگاہ میں مسلمان بچوں کی تربیت ہو رہی تھی اس سے کیا نتائج برآمد ہونے والے تھے، اس بارہ میں علیگڑھ کے عظیم فرزند مولانا محمد علی جوہر نے انڈین کانگریس کے اجلاس منعقدہ ۱۹۲۳ء کی صدارت فرماتے ہوئے اپنے خطبہ صدارت میں ایک واقعہ بیان کیا ہے جس کا ذکر خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ بعض انگریز پروفیسروں کی روش کے خلاف کالج کے طلباء نے سٹرائک کر دی تو انہی ایام میں یوم بانی کالج کی سالانہ تقریب بھی آ پڑی جس میں مولانا نے بھی اپنی نظم سنائی اور نظم کے ایک شعر میں بانی کالج کو یوں خطاب کیا۔

سکھایا تھا تمہیں نے قوم کو یہ شور و شر سارا
جو اس کی انتہا ہم ہیں تو اس کی ابتدا تم تھے

اسی خطبہ صدارت میں مولانا نے مزید فرمایا کہ سرسید کے متعلق یہ نظریہ رکھنے میں وہ تنہا نہ تھے جس کی تائید میں وہ ایک اور دلچسپ واقعہ بیان کرتے ہیں جو یوں ہے۔ مولانا کے برادر اکبر مولانا شوکت علی ہنوز ملازمتِ سرکار میں تھے کہ ایک روز ایک انگریز افسر نے ان سے سوال کیا۔ "مسٹر شوکت علی! جانتے ہو ہندوستان میں انگریزی حکومت کا سب سے بڑا باغی کون ہے؟" مولانا کے جواب کی تشنیع کرتے ہوئے اس انگریز افسر نے کہا: "انگریز کے اقتدار کا سب سے بڑا دشمن اور باغی وفاداروں کا وفادار سرسید احمد خان ہے۔" مولانا کے اظہارِ استعجاب پر وہ انگریز افسر پھر یوں گویا ہوا۔ "کیا آپ خیال کرتے ہیں کہ جو نوجوان علیگڑھ میں وہی تعلیم پا رہے ہیں جو ہمارے اپنے بچوں کو ہیرو اور ونچسٹر میں ملتی ہے اور جن کو انہی جیسی صاف ستھری زندگی بسر کرنے کا عادی بنایا جا رہا ہے اور جو ہماری اپنی کھیلوں میں ہمیں شکست دے سکتے ہیں، یہ نوجوان سمندر پار سے آنے والے انگریز افسروں کی ماتحتی اور غلامی پر قناعت کریں گے؟ نہیں! مسٹر شوکت علی ہندوستان میں برطانوی اقتدار کا خاتمہ اب چند دنوں کی بات ہے۔ میں پھر کہتا ہوں کہ سید احمد خان آج کے دن سب سے بڑا باغی (ARCH - REBEL) ہے۔"

مولانا شوکت علی سے مخاطب انگریز افسر سرسید اور انکے کالج کے متعلق ایسے خیالات رکھنے والا منفرد قسم کا حاکم نہ تھا۔ اور بھی بلند مرتبت انگریز ابتدا ہی سے مدرسۃ العلوم کے قیام کے سخت مخالف تھے۔ لارڈ کرزن کے عہدِ حکومت میں تو گورنر جنرل کے ایما پر ہی کالج کو اس کے بانی کے مقاصد سے ہٹا کر محض عربی تعلیم کا ایک مدرسہ بنا دینے کی سازش بھی کی گئی جو ٹرسٹیان کالج کی ہوشمندی اور بروقت مؤثر مدافعت کے سبب کامیاب نہ ہو سکی۔ ایسے ہی انگریز حکام کی شہ پاکر دو مسلمان ملازمان سرکار انگلشیہ مولوی امداد علی ڈپٹی کلکٹر اور مولوی علی بخش سول جج مذہب کا لبادہ اوڑھ کر آگے بڑھے اور ملک بھر میں گھوم پھر کر کالج اور اسکے بانی کے خلاف فضا کو مسموم کرنے کی سعیِ نامسعود میں مصروف ہوئے اور متعدد معروف اور غیر معروف علماء سے سرسید پر کفر والحاد کے فتوے پر صاد کروا لیا۔ اور پھر اسی پر بس نہ کی بلکہ مارو مار کرتے ہوئے مکہ اور مدینہ تک جا پہنچے اور وہاں کے مفتیانِ کرام سے بھی کالج اور اس کے بانی کے حق میں یہ سند لے کر لوٹے۔

"یہ مدرسہ جس کو خدا برباد اور اس کے بانی کو ہلاک کرے، اس کی اعانت ہرگز جائز نہیں ہے۔ اور اگر مدرسہ بن کر تیار ہو جائے تو اس کو منہدم کرنا اور اس کے بانی اور اس کے مددگاروں سے سخت انتقام لینا واجب ہے۔ اور ہر شخص جس میں حمیتِ اسلامی ہو واجب ہے اس مدرسہ کی مخالفت جہاں تک کہ قدرت ہو۔ اور ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ دل سے اس کا مخالف ہو۔ دین کی حفاظت کے لئے سید احمد کا قتل واجب ہے۔"

خدا کا شکر ہے کہ مدرسۃ العلوم کو ناکام بنانے میں انگریز کی سازش ناکام ہوئی اور ملّا کی آواز پر کسی نے کان نہ دھرا۔ اس کے فریب کا پردہ چاک ہوا۔ قوم نے سید اعظم کی پکار کو گوشِ ہوش سے سنا۔ شمعِ علم کے پروانے ملک کے گوشے گوشے سے سید کی نگری کی طرف ذوق و شوق سے کھنچے چلے آئے اور ہم نے خود دیکھا اور جانا کہ علیگڑھ کے در و بام پر اسی شمع کی کرنیں نورافشاں ہیں جو شمع کہ چودہ سو برس سے طاقِ حرم میں جگمگا رہی ہے۔

علیگڑھ کا خصوصی اندازِ تعلیم و تربیت کیا تھا اس کے بیان سے بخوفِ طوالت درگذر کیا جاتا ہے بجز اس کے کہ یہی نوبات سمٹ کر طلبا کالج سے سرسید کے ایک خطاب کے اس فقرہ میں آجاتی ہے کہ:

"یاد رکھو سب سے سچا کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے۔ اسی پر یقین کرنے سے ہماری قوم ہماری قوم ہے۔ اگر تم نے سب کچھ کیا اور اس پر یقین نہ کیا تو تم ہماری قوم نہ رہے۔ پھر اگر تم آسمان کے تارے بھی ہو گئے تو کیا؟ پس امید ہے تم ان دونوں باتوں (یعنی علم اور اسلام) کے نمونے ہو گے۔ جبھی ہماری قوم کی عزت ہوگی۔"

حقائق شاہد ہیں کہ جن لوگوں کے ہاتھوں میں مدرسۃ العلوم علیگڑھ کی باگ ڈور رہی وہ اسی نہج و اسلوب پر نونہالانِ قوم کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کرتے رہے اور اسی کا نتیجہ تھا کہ مولانا محمد علی جوہر نے جس ذہنی اضطراب کو زبانِ شعر میں شور و شر کا نام دیا تھا وہی اضطراب منظم کوشش کی صورت اختیار کر کے سرسید کی معنوی اولاد کے ہاتھوں قیامِ پاکستان پر منتج ہوا۔

یہ تھی داستان ماضی کی، تابناک ماضی کی۔ ایسے ماضی کی جس کی عظمت کو ہمارے حال کی بدحالی نے گہنا دیا ہے۔ سرزمینِ علیگڑھ میں اک مردِ خدا نے خلوص و محبت کا بیج بویا۔ بیج سے مدرسۃ العلوم نام کا ایک ننھا سا پودا پھوٹا۔ پودے کو مردِ خدا نے اپنے خونِ جگر سے سینچا۔ پودا بڑھا، پھولا، پھلا اور ایک تن آور درخت بن گیا۔ درخت نے پاکستان کا نام پایا۔ پاکستان گھنی چھاؤں اور شیریں پھل دینے والا شجرِ پُربہار! ہم نے اس کا پھل کھایا۔ بعضوں نے بہت کھایا۔ بعضوں نے کم کھایا۔

اور بعض نعمتیں کھانے والوں کا منہ تکتے رہے۔ درخت کیسا بھی ہو، آبیاری کا تقاضا کرتا ہے۔ ہم پاکستان کے شجرِ عجیب کی آبیاری تو کیا کرتے، ہم نے تو اس کا پھل کھاتے کھاتے عالمِ بدمستی میں اس کے تنے پر کلہاڑا چلا دیا۔ اس کا ایک حصہ جسم سے کٹ کر دُور جا گرا۔ اتنی دور کہ اب اغیار اُسے اپنے دشمن کے کام میں لا رہے ہیں۔ الاؤ جل رہا ہے اور ہم مجبور تماشائی ہیں۔ یاس و ناامیدی کی تصویر بنے ہوئے۔ ہم ان ستمگروں سے امیدِ غمگساری لگائے بیٹھے ہیں جن کا دستِ ستم اس عظیم المیہ میں پس پردہ مسلسل اور پیہم مصروفِ عمل رہا۔

ہم میں خود اعتمادی کا فقدان کیوں ہے؟ ہم یہ کیوں نہیں دیکھ پا رہے کہ پاکستان کے شجرِ عظیم کی مضبوط جڑیں بفضل تعالیٰ اپنی جگہ قائم ہیں۔ کیوں نہ ہم پھر سے اس کی آبیاری میں لگ جائیں؟ یہ شجرِ عجیب عظیم سے عظیم تر ہوتا چلا جائے گا۔ بہ شرط یہ ہے کہ آبیاری ندامت کے آنسوؤں اور جگر کے خون سے کرنا ہوگی۔

بات گھوم پھر کر نئی نسل کی تعلیم پر ہی آ ٹھہرتی ہے۔ ہم نے اس سے مجرمانہ غفلت برتی۔ نظریۂ پاکستان بھلا دیا گیا۔ عیش امروز نئی نسل کا مقصودِ زندگی ٹھہرا۔ نتیجہ سب کے سامنے ہے۔ اجتماعی بداعمالی کی سزا بہت جلد ملا کرتی ہے کہ ؎

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

آیئے، آخر میں اپنے بیان کے متعلقہ تعلیم کا مختصر سا جائزہ لیں۔ مسئلہ تعلیم کے اقنوم ثلاثہ ہیں علم، معلّم اور متعلّم۔ علم ایک بحرِ ناپیدا کنار ہے جس کی موجیں حدود نا آشنا ہیں۔ اس کے مقابل انسانی زندگی محدود اور مختصر ہے۔ اس لیے ہر طالب علم کو پہلے سے جان لینا چاہیئے کہ وہ کن اشیاء کا علم حاصل کرے گا۔ اور تکمیل تعلیم کے بعد اسے معاشرے کا ایک مفید فرد بننا ہے اور پھر ہر معاشرہ زندگی کے متعلق ایک مخصوص نظریہ رکھتا ہے۔ لہذا کسی معاشرے کے اندر رہتے ہوئے علمی کاوش بھی اُسی نظریۂ زندگی کی عکاسی ہونی چاہیئے۔

بدقسمتی سے ہم نے اپنے نظریۂ تعلیم کو اسلام اور قرآن کے پیش فرمودہ نظریۂ حیات سے ہم آہنگ کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ بلکہ زیادہ صحیح بات تو یہ ہے کہ ہمارے ہاں سرے سے کوئی نظریۂ تعلیم موجود ہی نہیں۔ تعلیم کا مقصد بجز اس کے ہم کچھ نہیں جان پائے کہ زیورِ تعلیم سے آراستہ ہو کر ایک فرد اپنے اندر معاشی استحصال کی وافر صلاحیت رکھتا ہے۔ ہمارے یہاں مسئلہ تعلیم کا دوسرا اہم پہلو اساتذہ کی قلت ہے۔ اگرچہ ایسے لوگوں کی تو کمی نہیں ہے جو درس و تدریس کو ذریعہ معاش بنائے ہوتے ہیں لیکن ان لوگوں کی حقیقتاً شدید قلت ہے جو ذہنی طور پر بھی استاد ہیں۔ اُستاد و معلّم ہرگز ایک پیشہ نہیں بلکہ یہ تو ایک ذہن ہے۔ ایک ایسا ذہن جس کا حامل معاشرے کا شریف ترین اور افضل ترین انسان ہی ہو سکتا ہے۔ ہمارے تعلیمی اداروں میں جو حضرات درس و تدریس کے فرائض سرانجام دیتے ہیں ان میں غالب اکثریت اُن افراد کی ہے، معلّمی کا پیشہ جن کی مجبوری ہے۔ وہ ہمیشہ اس تاک میں رہتے ہیں کہ کسی زیادہ منفعت بخش کاروبار میں اُن کی کھپت ہو سکے۔ تو اس مغز کھپائی سے رہائی پائیں۔ بھلا ایسے استادوں سے شاگردوں کو کیا فیض پہنچے گا؟

ایک اُستاد کا ذہن رکھنے والے افراد کیسے ہوتے ہیں؟ اس کی ایک دو مثالیں پیشِ خدمت ہیں:

۱۸۹۵ء میں ایم۔ اے۔ او۔ کالج علیگڑھ کا ایک طالب علم بی۔ اے کے امتحان میں الہ آباد یونیورسٹی بھر میں تیسری پوزیشن حاصل کرتا ہے اور سائنس کے طلباء میں اسے اول پوزیشن حاصل ہوتی ہے۔ کالج کے پرنسپل مسٹر بیک کی سفارش پر حکومت کے

ڈپٹی کلکٹر کا عہدہ پیش کرتی ہے کہ یہ عہدہ آج سے پون صدی قبل ہندوستان میں ایک گریجوایٹ کے لئے معراج ترقی متصور ہوتا تھا۔ لیکن یہ نوجوان کہ ایک استاد کا ذہن رکھتا تھا یہ پیشکش قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے اور اپنے ہی کالج میں ساٹھ روپے کے مشاہرہ پر استاد بن جاتا ہے۔ سرسیدؒ کے روبرو پیش ہوتا ہے اور قاعدہ کے مطابق سرسید اُسے معاہدہ کا ایک مسودہ پیش کرتے ہیں جس کا ماحصل یہ تھا کہ پانچ سال تک کالج کی ملازمت ترک نہ کریگے۔ نوجوان نے مسودہ پڑھا اور کہا کہ میرا ارادہ تو علیگڑھ میں پوری زندگی بسر کرنے کا ہے۔ سرسیدؒ پر اس جواب کا یہ اثر ہوا کہ فوراً مسودہ چاک کر دیا اور نوجوان سے کہا۔ جاؤ کام کرو۔ آپ یقیناً جاننا چاہیں گے کہ یہ نوجوان کون تھا۔ یہ نوجوان تھا مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کا مشہور وائس چانسلر ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد۔

علیگڑھ ہی کے ایک اولڈ بوائے جو آکسفورڈ یونیورسٹی کے آنرز گریجویٹ اور بار ایٹ لا رہیں عمر بھر علیگڑھ میں تاریخ اور علم سیاسیات کا درس دیتے رہے اور ریٹائر ہونے پر یونیورسٹی کے نواح میں ہی سکونت پذیر ہو گئے۔ برعظیم کا بٹوارہ ہو چکا تھا۔ ریٹائرڈ استاد کے قدیم مراسم نہرو خاندان سے تھے۔ پنڈت جواہر لعل نے ان کو ایک اسلامی ملک میں بھارت کا سفیر بنا کر بھجوانا چاہا۔ اس پیشکش پر بوڑھے استاد کا ردعمل اور جواب سنیئے۔ فرمایا۔ "پنڈت جی! زندگی میں میری بڑی خواہشیں دو ہی تھیں۔ ہندوستان کا وزیر اعظم بننا اور استاد بننا۔ وزیر اعظم میں بن نہیں سکتا۔ استاد بن چکا ہوں۔ سفارت وغیرہ کی ہوس نہیں ہیں علیگڑھ ہی میں مرنا چاہتا ہوں۔"— ملاحظہ فرمایا آپ نے استاد کا ذہن رکھنے والے استاد کی نگاہ میں اپنا مقام کیا ہے؟ یا استاد یا وزیر اعظم!

مقام فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں!
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے!

استاد کا ذہن رکھنے والے اساتذہ کا درجہ اور مقام ان کے تلامذہ کے نزدیک کیا ہوتا ہے اس کے لئے بھی علیگڑھ ہی کے ایک استاد اور شاگرد کا قصہ ہدیۂ خدمت ہے۔

مولانا محمد علی جوہر کا قول ہے کہ دنیا کی حسین ترین چیز ماں ہے۔ اور میری ماں دنیا کی حسین ترین ماں ہے۔ اپنی ماں سے محمد علی کی بے پناہ محبت کو نگاہ میں رکھیئے اور یہ بھی خیال رہے کہ محمد علی اپنے دور میں انگریز کا سب سے بڑا دشمن تھا۔ اسی محمد علی نے ایک بار تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔ "میں اسلام کی خاطر اپنے بھائی کو قتل کر سکتا ہوں۔ اپنی پیاری ماں کا رشتۂ حیات منقطع کرنے پر بھی تیار ہو جاؤں گا۔ لیکن اگر میری تلوار کی زد میں کوئی انگریز ہوا اور وہ نیلی آنکھوں والا انگریز ہوا۔ اور اس کی نیلی آنکھوں پر میری نگاہ جا پڑی تو میرا ہاتھ کانپ جائے گا۔ تلوار میرے ہاتھ سے چھوٹ کر گر جائے گی۔ مجھے اپنی خلاں انگریز استاد کی نیلی آنکھیں یاد آجائینگی۔

رہا معاملہ طلبا کا۔ تو وہ تو ہر جگہ ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔ ان کا سنورنا یا بگڑنا تو انہی دو باتوں پر منحصر ہے کہ ان کو تعلیم دینے والے کون ہیں اور کیسے ہیں اور جو تعلیم ان کو دی جا رہی ہے کیا ہے اور کیسی ہے۔

اب کرنے کا کام یہ ہے کہ نصابِ تعلیم کو ضمیرِ قرآن کے مطابق ترتیب دیا جائے۔ اور فی الوقت کم از کم ایک ادارہ ضرور ایسا قائم کر دیا جائے جہاں صرف ایسے اساتذہ ہی رہ پاسکیں جو فی الحقیقت استاد کا ذہن رکھتے ہوں۔ اور جو فکری اور علمی طور پر سیرت سازی کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ سارا کام کچھ ایسا آسان بھی نہیں ہے۔ اس مہم

کو کسی ایسی ہستی کی راہنمائی میں ہی سر کیا جا سکتا ہے جو فکرِ سرسیدؒ کی صحیح تعبیر کر سکے۔ ہیں، اگر تناسخ کا قائل ہوتا تو یہ دعویٰ کر لینے میں مجھے ذرا بھی حجاب نہ ہوتا کہ سرسید کو اسلام اور مسلمانوں سے جو بے لوث محبت تھی اس نے انہیں جنت الفردوس میں بھی بے چین رکھا۔ اور یہ جان کر کہ اس تیرہ بخت قوم کو برِ عظیم میں ایک بار پھر ۱۸۵۷ء کے سے حالات کا سامنا ہوگا وہ بے قرار روح مفکرِ قرآن جناب غلام احمد پرویز کی شکل میں پھر ہمارے درمیان آموجود ہوئی ہے۔

(ختم)

گجرات میں پرویز صاحب کا خطاب

مورخہ ۲۹ ستمبر ۱۹۷۲ء (بعد از نمازِ جمعہ) بزمِ گجرات اور جلال پور جٹاں کے احباب کی مشترکہ سعی و کاوش سے ایک جلسۂ عام کا اہتمام کیا گیا۔ گجرات میں مفکرِ قرآن کا یہ پہلا خطاب تھا۔ لیکن حاضرین کی تعداد سے اندازہ ہوتا تھا کہ قرآن کی آواز کو سننے کے لئے اب فضا کافی سازگار ہو چکی ہے۔ خطاب کا موضوع تھا

"اقبال اور قائدِ اعظم کے تصوّر کا پاکستان"

گجرات میں ایک بڑا عظیم الشان ہال ہے جسے زمیندارہ کالج ہال کہا جاتا ہے۔ اس ہال میں گجرات اور اس کے گردو نواح کے لوگ جوق در جوق آ رہے تھے۔ طلباء، اساتذہ اور دانشوروں کی شمولیت سے یہ جلسہ نہایت بارونق ہو گیا تھا۔ اس میں مفکرِ قرآن نے حسبِ معمول اپنے مخصوص انداز سے 'پاکستان' کی فکری وجۂ جواز کو بیان کیا، جس سے سامعین بڑے متاثر ہوئے۔

یہ خطاب قریب دو گھنٹے کا تھا۔ گجرات کے احباب کا خیال تھا کہ اس شہر میں ایسی فکری اور رشد کی محفل اس سے پہلے دیکھنے میں نہیں آئی۔ بزمِ گجرات اور بزمِ جلال پور جٹاں بجا طور پر اس جلسہ کے انعقاد اور اسے ذوق و شوق سے کامیاب بنانے پر لائقِ تحسین اور قابلِ مبارکباد ہیں۔ امید ہے ان کی یہ کامیاب کوشش یقیناً اس علاقے میں دور دور تک قرآنی شمع کی روشنی کو پہنچانے کا موجب بنے گی۔

بزمِ گجرات نے اس جلسہ میں شرکت کے لئے باہر سے آنے والے مہمانوں کی جس قدر عزت افزائی اور مہمان نوازی کا ثبوت دیا، اس پر بھی ادارہ بزمِ گجرات کو مبارکباد کہتا ہے۔ امید ہے کہ اس طرح کی ایمان افروز اور فکر انگیز محفلوں کا انعقاد گاہے گاہے ہوتا رہے گا۔

(ناظم ادارہ طلوعِ اسلام)

نایاب کتابوں کے نئے ایڈیشن

پرویز صاحب کے سلسلہ معارف القرآن کی ابتدائی کتابوں کے سابقہ ایڈیشن مدت سے ختم ہو چکے تھے اور جویانِ علم و حقائق ان کے لئے بے حد مضطرب۔ بحمد اللہ کہ اب ان کے جدید ایڈیشن مصنف کی نظر ثانی کے بعد پھر سے شائع ہونے شروع ہو گئے ہیں۔ ان میں سے پہلی کتاب ہے

ابلیس و آدم

جس میں ہیں دین کے بنیادی تصورات ۔۔۔ انسان کی پیدائش اور کائنات میں اس کا مقام، قصۂ آدم اور نظریۂ ارتقاء، ملائکہ کی حقیقت اور ان کا آدم کو سجدہ، ابلیس اور شیطان کی اصل اور ان کی اثر انگیزیاں، جنّات کی حقیقت، وحی کی غایت، زندگی کے اہم مسائل کے حل کے لئے اس کی راہ نمائی کی ضرورت، مقامِ نبوت اور منصبِ رسالت، جیسے موضوعات کی نہایت بصیرت افروز اور حقائق پرور تشریحات۔ اور اس کے ساتھ اسلوبِ بیان بیحد دلکش اور جاذب۔

قیمت مجلد (گرد پوش) :۔ پندرہ روپے (۱۵)
(علاوہ محصولڈاک)

اور اسی سلسلہ کی دوسری کتاب

جوئے نور

ابھی ابھی تیار ہو کر آئی ہے۔ اس میں تاریخ اور قرآن کا باہمی تعلق، انبیائے سابقہ اور اقوام گزشتہ کی داستانیں بیان کرنے سے مقصد، مارکس کے فلسفۂ تاریخ اور قرآن کے نظریہ میں بنیادی فرق۔ ان تفصیلات کے بعد حضرت نوحؑ سے لے کر حضرت شعیبؑ تک کے انبیاءِ کرام اور ان کی قوموں کا تذکرہ۔ ان اقوام کی تباہی کے اسباب اور ان کا ہمارے ساتھ تعلق ۔۔ "عذابِ خداوندی" کا صحیح مفہوم۔ نظریۂ قومیت۔ ہجرت۔ معاشی نظام کی قرآنی تشریح۔ ایسے اہم موضوعات پر سیر حاصل بحث اور دلنشیں پیرایۂ بیان۔

قیمت مجلد (گرد پوش) پندرہ روپے (۱۵)
(علاوہ محصولڈاک)

ملنے کا پتہ

(۱) مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور　(۲) ادارہ طلوع اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور

طلوعِ اسلام کنونشن ۱۹۷۶ء

آخری قسط

مجلسِ مذاکرہ

موضوع:- آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

(گذشتہ سے پیوستہ)

(۱۳)

عادلی سلطانہ

محترمہ صدرِ بزم و مکرم شرکائے محفل!

میں قرآن مجید کی طالبہ ہوں اور میرا مسلک یہ ہے کہ زندگی کا جو اہم سوال بھی سامنے آئے اُسے قرآن کی روشنی میں سمجھوں اور اُسی کی روشنی میں سمجھاؤں۔ اسی بنا پر میں مذاکرہ کے موضوع کو بھی اسی آئینے میں دیکھوں گی اور اسی کا عکس آپ کی نگہِ بصیرت کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کروں گی کہ نہ آئینے سے بڑھ کر کوئی سچا ہو سکتا ہے اور نہ ہی اس کے عکس سے بہتر کوئی حقیقت کا مظہر۔

غالب نے عالمِ بشریت کو دو شعبوں میں تقسیم کیا ہے یعنی آدمی اور انسان۔ لیکن قرآن مجید نے اس کی تین مختلف شعبیں کی ہیں۔ وہ ہر اُس فرد کو جو پیکرِ بشری میں سامنے آتا ہے "ابنِ آدم" کہہ کر پکارتا ہے۔ اسے ہم اپنی زبان میں آدمی کہتے ہیں۔ اس کے بعد وہ بنی آدم کو دو شقوں میں تقسیم کرتا ہے۔ یعنی انسان جو اس کی پست سطح ہے اور مومن جو اس کی بلند منزل ہے۔ بالفاظِ دیگر غالب جس پیکر کو آدمی کہہ کر پکارتا ہے قرآن اُسے انسان کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔ اور جس جانِ ارزند لیکن جوہرِ نایاب کو وہ انسان کہتا ہے قرآن کی اصطلاح میں اُسے مومن کہا جاتا ہے۔

قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ زندگی اپنے اوّلین جرثومے سے ارتقائی منازل طے کرتی اور مختلف منازل سے گزرتی، لاکھوں کروڑوں سال کی مدت میں، انگڑائیاں لیتی اور ہر انگڑائی کے بعد حسین تر اور بلند تر ہوتی پیکرِ حیوانی میں نمودار ہوئی۔ اس سلسلہ ارتقا کا انداز یہ ہے کہ زندگی جب اگلی یا اونچی سطح پر پہنچتی ہے تو وہ اپنی سابقہ یا نچلی سطح کی بہت سی خصوصیات بھی اپنے ساتھ لاتی ہے اور اس کے بعد اس بلند سطح کے امتیازی جوہر بھی اس میں نمودار ہو جاتے ہیں۔ جب زندگی حیوانی سطح سے بلند ہو کر انسانی سطح پر پہنچی تو وہ اپنی سابقہ سطح کی بہت سی خصوصیات بھی یوں کہیے کہ جہیز میں اپنے ساتھ لائی۔ ان خصوصیات کو حیوانی جبلتیں یا (ANIMAL INSTINCTS) کہا جاتا ہے اور انسانی سطح کا وہ

جوہر جس سے زندگی پہلی بار آراستہ ہوئی اس کا صاحبِ اختیار و ارادہ ہونا ہے۔ حیوانی جبلتیں تفصیل کے اعتبار سے تو بہت ہیں لیکن بنیادی طور پر انہیں تین شقوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ یعنی جذبۂ تحفظِ خویش۔ جذبۂ تغلب اور جذبۂ افزائشِ نسل۔ چونکہ زندگی ان ہی جذبات کے سہاروں سے قائم رہتی اور انہی کے تحرک سے آگے بڑھتی ہے۔ اس لئے ان کی قوت بھی بڑی مستحکم ہوتی ہے اور زندگی انہیں محفوظ بھی بڑی شدت سے رکھتی ہے۔ حیوانی سطح پر ان جذبات کی کارفرمائی پر فطرت خود اپنا کنٹرول رکھتی ہے اس لئے یہ سرکش اور بے لگام نہیں ہونے پاتے ہیں۔ لیکن انسان کو چونکہ اختیار و ارادہ کی صلاحیت سے نوازا گیا ہے۔ اس لئے یہاں پہنچ کر فطرت اپنے کنٹرول کا ہاتھ کھینچ لیتی ہے۔ اور ایسا ہونا بھی چاہیئے تھا۔ یہ تو دینے والے کے دستِ عطا کے شایانِ شان نہ ہوتا کہ وہ ایک ہاتھ سے انسان کو اختیار و ارادہ کی قدرت عطا کرتا اور اس پر فطرت کا کنٹرول بدستور رکھ کر دوسرے ہاتھ سے اُسے سلب کر لیتا۔ یہ خدا کی بخشش نہ ہوتی ملا کی شریعت ہوتی جس میں وہ عورت کو ایوانِ نکاح میں داخل ہونے سے پہلے تو ردّ و قبول اور اقرار و انکار کی پوری پوری آزادی دیتا ہے لیکن جب وہ بسم اللہ پڑھ کر گھر کے اندر قدم رکھ دیتی ہے تو وہ یہ کہہ کر پیچھے سے دروازہ بند کر دیتا ہے کہ اب تم اپنی مرضی سے اس سے نکل نہیں سکتی۔ خدا کی عطا ایسی نہیں ہوتی۔ یہ تو پھر بھی انسان کے اختیار و ارادہ کی صلاحیت ہے۔ اقبالؒ تو خود انسانی زندگی کے متعلق کہتا ہے کہ

جانے کہ دادند، دیگر نگیرند ۔ آدم بمیرد از بے یقینی!

(خدا نے انسان کو جو جان عطا کر دی ہے تو وہ اسے واپس نہیں لیتا۔ انسان خود اپنی بے یقینی سے مر جاتا ہے)

اب تو بات انسانی جذبات کی ہو رہی تھی۔ اگر انسان نے کہیں جنگلوں میں رہنا ہوتا تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں تھا کہ وہ اپنے ان حیوانی جذبات کی تسکین، اپنے اختیار و ارادہ سے جس طرح جی چاہے کرے لیکن اس نے تو ایک دوسرے کے ساتھ مل کر رہنا ہے۔ اس طرزِ زندگی میں ایک فرد کا واسطہ قدم قدم پر دوسرے افراد کے ساتھ پڑتا ہے۔ اب ذرا تصور میں لایئے نقشہ اس تمدنی زندگی کا جس میں حیوانی جبلتیں تو ہر فرد کے اندر اس شدت اور توانائی کے ساتھ موجزن ہوں۔ لیکن ان پر کنٹرول کسی کا نہ ہو۔ اس نقشے کو سامنے لانے کے لئے ان حیوانی جذبات کو بھی نگاہ میں لایئے جو ہر انسان کے خمیر میں مضمر ہیں اور جنہیں قرآن مجید نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ مثلاً:

اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ۔ (۷۰/۱۹) انسان تو بڑا ہی تھڑدلا اور بے صبرا واقع ہوا ہے۔ ایسا تھڑدلا اور بے صبرا کہ اس کا کبھی پیٹ ہی نہیں بھرتا۔ پھر اس کے ساتھ

وَكَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا ۔ (۱۷/۱۰۰) تنگ دل اور بخیل ایسا کہ چاہتا ہے کہ ساری دنیا کی دولت سمیٹ کر اپنے ہی لئے مختص کر لے اور کسی کو اس میں سے ایک پائی تک نہ دے۔

كَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا (۱۷/۶۷) ناشکرا ایسا کہ جو کچھ اسے حاصل ہو اس کے متعلق کبھی اعتراف تک نہ کرے کہ اس کے حصول میں ان اسباب و ذرائع کا بھی کچھ حصہ ہے جو خدا کی طرف سے بلا مزد و معاوضہ حاصل ہوتے ہیں۔

وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا ۔ (۱۷/۱۱) جلد باز ایسا کہ ایک دن میں کروڑ پتی بننے کی خواہش میں حواس باختہ پھرے۔

وَكَانَ الْإِنْسَانُ أَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا (۱۸/۵۴) اور اس ہوسِ بے پناہ کی تسکین کے لئے جو کچھ کرے اس میں معقولیت پسندی سے کام نہ لے بلکہ لڑائی جھگڑا شروع کر دے۔

إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا (۳۳/۷۲)۔ اس طرح سب کچھ پڑھ لکھ جانے کے باوجود جاہل کا جاہل رہے اور سب کچھ جاننے کے باوجود ظلم و زیادتی سے باز نہ آئے۔

یہ ہوں اس کے جذبات، اور حالت اس کی یہ ہو کہ

خُلِقَ الْإِنْسَانُ ضَعِيفًا (۴/۲۸)۔ کہ جب انہیں بے باک چھوڑ دے تو یہ اسے اس طرح پچھاڑ دیں کہ اس میں اٹھنے کی سکت نہ رہے۔

خوب غور کیجئے عزیزانِ من! کہ جس معاشرہ میں وہ مخلوق بستی ہو جس کے سینے میں ایسے بے پناہ جذبات شعلہ بار ہوں اور اس پر فطرت کی طرف سے کسی قسم کا کنٹرول نہ ہو تو اس معاشرہ کا کیا حشر ہوگا۔ یہی تھی وہ مخلوق جسے دیکھ کر غالب چیخ کر پکار اٹھا تھا کہ

ڈرتا ہوں آدمی سے کہ مردم گزیدہ ہوں!

اور یہی تھا وہ بے زمام انسان یعنی ڈرائیور کے بغیر وہ انجن جس کے متعلق ڈین انگے نے کہا تھا کہ

> یہ شاہراہِ حیات پر بے مقصد چلا جا رہا ہے۔ اسے کچھ پتہ نہیں کہ اسے کہاں جانا ہے اور اس نے یہ راستہ کیوں اختیار کیا ہے۔ نہ اس کا کوئی عقیدہ ہے نہ ضابطۂ حیات، نہ معیارِ اقدار۔ (THE FALL OF IDOLS)

اور علامہ اقبالؒ نے باصد حسرت و یاس کہا تھا کہ

> یہ اپنی فکری دنیا میں خود اپنی ذات کے خلاف ستیزہ کار رہتا ہے۔ اور سیاسی دنیا میں دوسروں کے خلاف تیغ آزما۔ یہ نہ اپنی لگام بریدہ سرکشی کو ضبط میں لا سکتا ہے اور نہ ہی ہوسِ زر پرستی کی تسکین کا سامان فراہم کر سکتا۔ یہی وہ چیزیں ہیں جو اس کے تمام بلند مقاصد کو تباہ کر رہی ہیں اور ایسی کیفیت پیدا کر رہی ہیں کہ وہ زندگی کے ہاتھوں بیزار ہے۔ (خطبات، ۱۷۷)

افراد کے ان جذبات کو ساحلوں کے اندر محصور رکھنے کے لئے سوسائٹی کچھ قوانین وضع کر لیتی ہے۔ لیکن انسانی تاریخ اس تلخ حقیقت کی شاہد ہے کہ یہ طریقِ کار اس مقصد کے حصول کے لئے بجد ناکام رہا ہے۔ اس ناکامی کی شہادت کے لئے کہیں ماضی میں جانے کی ضرورت نہیں۔ آپ عصرِ حاضر میں دیکھئے وہ کون سا ملک ہے جس میں حکومت کی طرف سے بلند اخلاقی قوانین نافذ نہیں اور وہ کون سا خطۂ زمین ہے جس میں ان قوانین کی مٹی پلید نہیں ہوتی۔ یہ حالت ایک ملک کے اندر افراد کی ہے۔ اور جب ہم مختلف اقوام پر نظر ڈالتے ہیں تو (MAKE - MAN) کے الفاظ ہیں:

> وہ ایک دوسرے کے سامنے وحشی درندوں کی طرح غرّاتی دکھائی دیتی ہیں جن کے پیشِ نظر اصول صرف ایک رہ گیا ہے اور وہ یہ کہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔

اور علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ آج اقوامِ عالم کی حالت یہ ہے کہ اس میں

ہر گرگ کو ہے برۂ معصوم کی تلاش!

لہٰذا افراد ہوں یا اقوام، اور اقوام بھی تو بالآخر افراد ہی کا مجموعہ ہوتی ہے، ان سب کی یہ حالت ہے کہ حیوانی جذبات پر

کسی سسٹم کا کنٹرول نہ ہونے کی وجہ سے غالب کے الفاظ میں صفِ انسانیت سے گرتے جاتے ہیں۔

انسان کی اس حالت سے کبیدہ خاطر اور دل برداشتہ ہو کر بعض ایسے ارباب تجسس نے جن کے (بدقسمتی سے) اعصاب کمزور تھے اس وحشت و درندگی کا علاج یہ سوچا کہ ان جذبات ہی کو فنا کر دیا جائے جو اس تمام کشمکش اور ہلاکت کی بنیاد ہیں تاکہ ــــ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری ــــ مہاتما بدھ کا نروان۔ شنکر اچاریہ کا یوگ۔ عیسائی راہبوں کا مسلکِ رہبانیت اور مسلمان اہلِ طریقت کا مشربِ خانقاہیت؛ اسی شدتِ احساس کی تخلیق ہے لیکن جذبات کشی کا یہ تصور فریبِ نفس سے زیادہ کچھ نہیں۔ جن جذبات کے سہارے خود زندگی قائم ہے، بھلا زندگی انہیں فنا ہونے دے گی؟ آپ ان جذبات کو دبا سکتے ہیں، فنا نہیں کر سکتے۔ انہیں دبانے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب ان کی تسکین کے فطری دروازے بند کر دیئے جائیں تو یہ سیلاب دیواروں میں شگاف کر کے باہر نکل آتا ہے۔ اسے نفسیات کی اصطلاح میں (PERVERSION) کہا جاتا ہے۔ ویسے بھی یہ بات عجیب سی نظر آتی ہے کہ خدا تو ان جذبات کو پیدا کرے اور خدا کے یہ (بزعم خویش) مقرب بندے انہیں فنا کرنے کی تدبیریں کرتے رہیں! کیا یہ خدائی پروگرام کے خلاف محاذِ جنگ قائم کرنا نہیں؟ قرآن نے تو خدا کے بندوں کی نشانی یہ بتائی ہے کہ وہ نظامِ کائنات پر مسلسل غور و فکر کے بعد اس عظیم نتیجہ کا اعلان کرتے ہیں کہ

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا۔ (۳/۱۹۱) اے جلتے نشو و نما دینے والے تو نے اس کارگہِ کائنات کی کسی شے کو باطل نہیں پیدا کیا۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ۔ (۱۵/۸۵) کائنات کی ہر شے بالحق پیدا کی گئی ہے۔ تو جس شے کو خدا نے بالحق پیدا کیا ہے اسے باطل قرار دے کر فنا کرنے کی کوشش حق پرستوں کا شیوہ کس طرح قرار پا سکتا ہے؟

قرآن مجید نے کہا ہے کہ نہ یہ جذبات شر اور باطل ہیں نہ ان کا فنا کرنا مقصودِ حیات۔ یہ تو زندگی کے قیام کا سہارا اور اس کے آگے بڑھنے کے لئے قوتِ محرکہ ہیں۔ ان کا میدانِ کار بڑا وسیع اور اس کے نتائج حیرت انگیز ہیں ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ انہیں حدود کے اندر رکھا جائے۔ اس وقت ان کے نتائج بجز تعمیری ہونگے۔ دریا کا پانی جب ساحلوں کے اندر بہے تو اس سے زندگی کی کھیتیاں لہلہانے لگتی ہیں، لیکن جب وہ ساحلوں کو توڑ کر سیلاب بن جائے تو اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہوتا ہے۔ قرآن مجید حدود فراموش، ساحل شکن، سرکش اور بیباک جذبات کو ابلیس یا شیطان کہہ کر پکارتا ہے اور انہیں ساحلوں کے اندر محدود و محصور کر دینے کے عمل کو اسلام کہتا ہے۔ اس دقیق اور لطیف نکتہ کو اس ذاتِ اقدس و اعظم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کہ جن سے بڑھ کر رموز آشنائے کائنات آسمان کی آنکھ نے نہیں دیکھا، نہایت بلیغ انداز سے بیان فرمایا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ دنیا میں ہر انسان کا ایک ابلیس ہوتا ہے۔ صحابہؓ نے تعجب سے پوچھا کہ کیا حضورؐ کا بھی ابلیس ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ ہاں میرا بھی ابلیس ہے لیکن میں نے اُسے مسلمان کر لیا ہے۔ بس یہ ہے عزیزانِ من! اس تمام کشمکش کا حل۔ جب انسانی جذبات کو مستقل اقدارِ خداوندی کے ساحلوں میں محصور کر دیا جائے تو اس کا نتیجہ تعمیری ہوتا ہے۔ جو لوگ انہیں ان حدود میں مقید کر دیتے ہیں انہیں مومن کہا جاتا ہے یعنی وہ جو خود بھی امن میں رہیں اور باقی افرادِ انسانیہ کو بھی امن کی ضمانت دیں۔

یہ خود کس طرح امن میں رہتے ہیں یہ نکتہ سمجھنے کے قابل ہے۔ انسانی جذبات میں سے کوئی جذبہ جب اپنی حد سے بڑھ

جائے تو انسانی ذات کا توازن بگڑ جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ عدمِ سکون اور فقدانِ اطمینان ہوتا ہے۔ اس کا علاج کیا ہے؟ قرآن اسے دو لفظوں میں اس حسن و جامعیت سے بیان کرتا ہے کہ جوں جوں نگہِ بصیرت اس پر غور کرتی ہے انسان وجد میں آ جاتا ہے۔ وہ مومنین کی ایک صفت کَاظِمِینَ الْغَیْظَ بتاتا ہے۔ اس میں کاظمین کا لفظ وہ آنکھ کا تل ہے جس میں تفصیلی حقائق کی ایک دنیا جھلمل جھلمل کر رہی ہے۔ عربوں کے ہاں پانی کی کمی ہوتی تھی۔ اس کے لئے وہ کرتے یہ تھے کہ نخلستانوں کے قریب برابر برابر بہت سے کنوئیں کھود لیتے تھے۔ اور انہیں ایک، زمین دوز سرنگ کے ذریعے آپس میں ملا دیتے۔ جب کبھی ایسا ہوتا کہ کسی ایک کنوئیں میں پانی کی سطح نیچے چلی جاتی تو جس کنوئیں میں پانی زیادہ ہوتا اس کا زائد پانی اس سرنگ کے ذریعے اس دوسرے کنوئیں کی طرف منتقل ہو جاتا۔ اس طرح مختلف کنوؤں میں پانی کی سطح کو ہموار رکھنے یعنی ان کے توازن کو برقرار رکھنے کے اس عمل کو کظامت کہا جاتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ مومن کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جب اس کا کوئی جذبہ زیادہ شدت اختیار کر لیتا ہے تو وہ اس زائد توانائی کا رخ اس طرف موڑ دیتا ہے جہاں توانائی کم ہوتی ہے۔ اس طرح وہ اپنی داخلی دنیا کا توازن برقرار رکھتا ہے اور اس کا امن و سکون بگڑنے نہیں پاتا۔ عصرِ حاضر کے علم النفس کی رو سے اسے (SUBLIMATION) کہا جاتا ہے۔ خدا نے جو قرآن کو شِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُورِ (۱۰/۵۷) کہا ہے تو اس سے مراد یہی ہے کہ جب انسان اپنے جذبات کو خدا کی متعین کردہ اقدار کے تابع رکھتا ہے تو اس کا توازن بگڑنے نہیں پاتا۔ اس سے انسان کی شخصیت متوازن (BALANCED) ہو جاتی ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ایک متوازن شخصیت ہی امن و سکون کی حامل قرار پا سکتی ہے۔ اور یہ بھی واضح ہے کہ جو معاشرہ اس قسم کے افراد پر مشتمل ہوگا وہ خود بھی امن میں رہے گا اور عالمِ انسانیت کے لئے بھی آیۂ رحمت ثابت ہوگا۔

ان افراد کو حقیقی امن و اطمینان نصیب ہو جانے کی ایک وجہ اور بھی ہے۔ میں نے اطمینان و سکون کے ساتھ حقیقی کے لفظ کا اضافہ اس لئے کیا ہے کہ اسے اس فریبِ نفس سے ممیز کر دوں جو ترکِ دنیا اور جذبات کشی کے انفعالی تصورات و مسالک کا فطری نتیجہ ہوتا ہے لیکن جسے اطمینانِ قلب کہہ کر اپنے آپ کو فریب دے لیا جاتا ہے۔ ہاں تو ان افراد کو حقیقی امن و اطمینان اس لئے میسر آ جاتا ہے کہ قانونِ ارتقا کا تقاضا یہ ہے کہ زندگی اپنی موجودہ سطح سے بلند ہو کر اگلی منزل میں پہنچ جائے۔ جو اس سطح سے ارفع و اعلیٰ ہے۔ قانونِ ارتقا کا یہ تقاضا ہوتا ہے لیکن انسان کے حیوانی جذبات اسے یا تو اس کی موجودہ سطح کے ساتھ چپکائے رکھنا چاہتے ہیں یا اس سے بھی پیچھے لے جانا۔ اس سے زندگی کے اہم تقاضے اور انسان کی حیوانی سطح میں ایک کشمکش شروع ہو جاتی ہے۔ قرآن کے الفاظ میں۔

وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنَاهُ بِهَا وَلَٰكِنَّهُ أَخْلَدَ إِلَى الْأَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوَاهُ۔ (۷/۱۷۶)

ہم چاہتے تھے کہ اسے اپنے قوانین کے ذریعے آسمان کی بلندیوں پر لے جائیں لیکن یہ اپنے حیوانی جذبات کے اتباع سے زمین کی پستیوں کے ساتھ چمٹے رہنا چاہتا ہے۔

نطشے نے اس حقیقت کو زرتشت کی زبان سے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

"میں دیروز (PAST) اور امروز (TO-DAY) ہوں لیکن مجھ میں کچھ اور بھی ہے جو فردا اور مستقبل (FUTURE) سے متعلق ہے۔"

جب زندگی کے اس امروز اور فردا میں کشمکش پیدا ہو جاتی ہے تو اس سے انسانی قلب اضطراب پیہم

کی آماجگاہ بن جاتا ہے جس کا لازمی نتیجہ فقدانِ طمانیت یا ذات کا عدمِ توازن ہے۔ مومن کی زندگی میں امروز اور فردا میں کشمکش نہیں ہوتی۔ اس کے امروز کا ہر سانس اس کے فردا کی تعمیر کا مسالہ بنتا چلا جاتا ہے۔ پرنسپل کیئرڈ کے الفاظ میں۔

"انسان کی ادنیٰ اور اعلیٰ زندگیوں کے تضاد میں توافق پیدا کرنے کا نام اخلاق ہے۔ یہ توافق اس طرح پیدا ہوتا ہے کہ ادنیٰ زندگی اعلیٰ زندگی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔"

مومن کی زندگی میں اس ادنیٰ اور اعلیٰ میں کامل توافق ہوتا ہے۔ اور یہی وہ انسان ہے جس کی تلاش میں غالب مارا مارا پھرتا رہا اور جب اس میں ناکام رہا تو تھک کر پکار اٹھا کہ،

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا ؛ آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

اور یہ پکار غالب تک ہی محدود نہ تھی۔ جیسا کہ باباجی نے شروع میں بتلایا ہے رومی بھی اس کی تلاش میں چراغ لیکر پھرتا رہا اور اقبالؒ بھی یہی آوازیں دیتا ہوا دنیا سے چلا گیا کہ،

اے بندۂ مومن تو کجائی تو کجائی!

لیکن اب ایسا نظر آتا ہے کہ رومی کی تلاش، غالب کی کاوش اور اقبالؒ کی پکار کے جواب ملنے کا وقت قریب آگیا ہے۔ اقبالؒ نے کہا تھا کہ

ڈھلتے ہیں میری کارگہِ فکر میں انجم ؛ لے اپنے مقدر کے ستاروں کو تو پہچان

آپ نے مذاکرے کے آغاز میں چمنستانِ قرآن کی ایک ننھی سی چڑیا کو یہ پیامِ بہار دیتے ہوئے سنا تھا کہ نہر کے کنارے ایک نئے کارخانے کی بنیاد رکھی جا رہی ہے۔ یہ وہ کارگہِ فکر ہوگی جس میں خدا کی صفات اَلْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ کی باندازِ دگر نمود اس طرح ہوگی کہ اس کے بنائے ہوئے پیکرانِ آب و گل کو تراش خراش کر قرآنی قالب میں ڈھالا جائیگا۔ اس بچی نے کہا تھا کہ ان جدید انسانوں کی نمائش سے ہم غالب کو جھٹلا سکینگے۔ اور میں ایک قدم آگے بڑھ کر خود خالقِ کائنات سے باصد ادب و احترام، اقبالؒ کی ہمنوائی میں یہ کہنے کی جرأت کرونگی کہ

تو شب آفریدی، چراغ آفریدم ؛ سفال آفریدی، ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی ؛ خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

(والسلام)

(۱۴)

نجمہ صدیقہ

محترمہ صدرِ مذاکرہ۔ میرے بزرگو۔ بہنو۔ اور بھائیو!

عارف باجی نے کہا ہے کہ اس معاملے میں دشواری یہ ہے کہ حیوانات پر فطرت نے اپنا کنٹرول رکھا ہے۔ اور انسان کو اختیار و ارادہ مل گیا ہے جس کے غلط استعمال سے فساد برپا ہوتا ہے۔ کسی حد تک یہ بھی درست ہے لیکن میرے نزدیک دشواری کی اصل وجہ کچھ اور ہے۔ اسے غور سے سنیئے۔

بکریاں سینکڑوں کی تعداد میں ہمارے پاس سے گزر جاتی ہیں ہم ان سے کبھی نہیں ڈرتے۔ بڑے تو ایک طرف بچے تک اُن سے لپٹ جاتے ہیں۔ اُن کی گردن میں باہیں ڈال لیتے ہیں، ان سے پیار کرتے ہیں۔ انہیں کان سے پکڑ کر کھینچتے ہیں۔ اُن کا دودھ بھی دودھ پیتے ہیں لیکن ان کے پیچھے پیچھے اگر گدی کتا آ رہا ہو تو اس سے سب محتاط رہتے ہیں۔ کوئی اُس کے قریب نہیں جاتا۔
جنگل میں ہرن نظر آئیں تو انہیں لپک کر پکڑنے کو جی چاہتا ہے لیکن شیر کی دھاڑ سنکر اوسان خطا ہو جاتے ہیں۔ پالتو خرگوش ہمارے بستروں تک میں گھسے رہتے ہیں۔ اُن سے ہم کوئی خطرہ محسوس نہیں کرتے لیکن سانپ کی سرسراہٹ سے سارا گھر حواس باختہ ہو جاتا ہے۔

یہ کبھی نہیں ہوتا کہ ہم بھیڑیئے کو بکری سمجھ کر اس کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ شیر کی دھاڑ کو ہرن کی ممیاہٹ خیال کر کے اُس کی طرف لپک کر چلے جائیں۔ سانپ کو خرگوش تصور کر کے اُسے آزادانہ گھومنے پھرنے دیں۔ ہم ایسا کیوں نہیں کرتے؟ اسلئے کہ بکریاں اور بھیڑیئے، ہرن اور شیر، خرگوش اور سانپ کی شکل و شباہت میں اس قدر فرق اور اُن کی آواز اور سرسراہٹ تک میں ایسا نمایاں اختلاف ہوتا ہے کہ ہمیں اُن میں تمیز کرنے اور پہچاننے میں ذرا بھی دقت نہیں ہوتی۔ اس لئے ہم شیر بھیڑیئے اور سانپ سے محتاط رہتے ہیں اور بکری، ہرن خرگوش سے خوف نہیں کھاتے۔

لیکن وہ ذات شریف کہ جسے آدمی کہہ کر پکارا جاتا ہے اور جو خود فریبی سے اپنے آپ کو اشرف المخلوقات تصور کر کے اینٹھے نہیں سماتا اُس کی کیفیت یہ ہے کہ شکل و شباہت کے اعتبار سے سب آدمی ہوتے ہیں۔ اس لئے ہم اُن سے فریب کھا جاتے ہیں۔ بڑے سے بڑا دیدہ ور بھی دو آدمیوں کو دیکھ کر نہیں بتا سکتا کہ اُن میں معصوم بھیڑ کون ہے اور درندہ بھیڑیا کون؟ خطرناک شیر کون ہے اور سادہ دل ہرن کون۔ پیکر محبت خرگوش کون ہے اور بس سے بھرا سانپ کون۔ یہ سب ایک جیسے دکھائی دیتے ہیں۔ سب معصوم بھیڑیں، سادہ دل ہرن، محبت بھرے خرگوش۔ لیکن جب چار قدم ان کے ساتھ چلو تو بھیڑ بھیڑیا بن کر کاٹتی ہے۔ ہرن شیر کی طرح جھپٹ کر کھا جاتا ہے۔ خرگوش سانپ کی مانند ڈس لیتا ہے۔ ذرا سوچئے کہ آدمی ہونے کی حیثیت سے قائد اعظمؒ محمد علی جناح اور شیخ مجیب الرحمٰن میں کیا فرق ہے۔ محترمہ فاطمہ جناح اور اندرا گاندھی میں کیا تفاوت ہے۔ آپ انہیں دنیا بھر کے سامنے پیش کر دیجئے۔ سب اُن دونوں کو آدمی اور ان دونوں کو عورتیں کہہ کر پکاریں گے لیکن غور کیجئے کہ جو فرق جناح اور مجیب میں ہے کیا اسی قسم کا فرق دو ہرنوں میں بھی ہوتا ہے؟ اور جو تفاوت فاطمہ جناح اور اندرا گاندھی تک میں ہے وہ دو بکریوں میں بھی کبھی پایا گیا ہے۔؟

قائد اعظمؒ اور مجیب، اور فاطمہ جناح اور اندرا کی بات تو پھر بھی دور کی ہے۔ آپ سوچئے کہ کیسی کیسی مقدس صورتیں تھیں جنہیں آپ نے راہنما سمجھ کر ساتھ لیا اور وہ جنگل میں جا کر راہزن ثابت ہوئے۔ کتنے وفا کے پتلے تھے جنہیں آپ نے رفیق سفر بنایا اور وہ گرہ کٹ نکلے۔ کتنے بھولے بھالے کبوتر نما خلوص کے پیکر دوست تھے جنہیں آپ نے اپنا ہمراز قرار دیا اور وہ مار آستین ثابت ہوئے۔ کتنے دلکش چہرے تھے جن کے متعلق بعد میں معلوم ہوا کہ وہ حقیقی چہرے نہیں مصنوعی نقاب (MASKS) تھے جن کے پیچھے بھیانک عفریت چھپے ہوئے تھے۔

سو اصل دشواری میرے بزرگو اور بھائیو! انسان کا اعتبار وارادہ نہیں، اصل دشواری فطرت کی یہ ستم ظریفی ہے کہ اُس نے آدمی کی سطح پر پہنچ کر بھیڑ اور بھیڑیئے، ہرن اور شیر، خرگوش اور سانپ۔ جناح اور مجیب۔ فاطمہ اور اندرا کو پیکر ایک جیسے دے دیئے۔ اسی سے یہ ساری چیخ و پکار ہے کہ وہ لے گیا۔ یہ کاٹ گیا۔ وہ ڈس گیا۔ یہ کھا گیا۔ وغ

اگر وہ حبیب کو بھیڑیئے اور ساتھیا کو ناگن کی شکل دے دیتی تو نہ کوئی فریب کھاتا نہ دشمن کو دوست سمجھ کر گلے لگاتا۔ اور نہ ہی علامہ اقبالؒ کو یہ شکوہ کرنا پڑتا کہ

خداوندا! یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری

یہ ہوئی پہلی دشواری۔ دوسری دشواری اور ہے۔

ایک بھیڑ پہلے دن سے لیکر آخری دن تک بھیڑ رہتی ہے۔ یہ کبھی نہیں ہوتا کہ وہ عمر کا ایک حصہ بھیڑ رہے پھر اسکے بعد یکایک بھیڑیا بن جائے۔ اسی لئے آپ کو اس سے کسی وقت بھی دھوکہ نہیں لگ سکتا لیکن یہ ذات شریف ہیں کہ کوئی کہہ نہیں سکتا کہ یہ کس وقت کیا سے کیا ہو جائینگے۔ آپ اپنے ہاں کے بڑے بڑے معتبر لیڈروں کی زندگی پر نگاہ ڈالئے اور دیکھئے کہ وہ کتنے مختلف جانوروں کا مجموعہ ہیں۔ وہ کبھی بھیڑ تھے کبھی بھیڑیا ہو گئے۔ کبھی ہرن بن گئے کبھی شیر کا روپ دھار لیا۔ آج خرگوش ہیں کل کو سانپ کی سیرت اختیار کر لی۔ یہی وجہ ہے کہ نہ ان کے ماضی سے ان کا حال پہچانا جا سکتا ہے، نہ حال سے مستقبل کے متعلق کوئی پیشگوئی کی جا سکتی ہے۔

کبھی بہت بڑے محب وطن تھے۔ آج سب سے بڑے کر ملت فروش۔ کبھی پکے پاکستانی بنتے اب ان جیسا غدار ہی کوئی نہیں۔ آج اس پارٹی کے ساتھ ہیں کل اُسکے بدترین دشمنوں کی صف میں۔ آج جس کی مدح و ستائش میں قصائد لکھے جا رہے ہیں کل اُسے دُشنام طرازی کا تختۂ مشق بنایا جائے گا۔ نہ کسی کے دین کا اعتبار نہ ایمان کا بھروسہ۔ حیا اور منافقت کرنا جانتا ہی نہیں۔ اسے اپنی صورت بدلنے پر اختیار نہیں۔ اور انسان کا یہ عالم کہ :-

ہر قدم پر اِک نئی صورت بنا لیتے ہیں لوگ
دیکھتے ہی دیکھتے کتنے بدل جاتے ہیں لوگ

اگرچہ یہ شروع ہی سے ایسا رہا ہے لیکن ہمارے دور میں اس نے اِس فن میں ایسا کمال حاصل کر لیا ہے کہ اس سے پہلے کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتا تھا۔ غالبؔ نے اپنے دور کے لوگوں کو دیکھ کر کہا تھا کہ

آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا

وہ اگر آج زندہ ہوتا اور ہمارے زمانے کی اس مخلوق کو دیکھتا تو نہ معلوم کیا کہتا؟

---

(۱۲)

سلمیٰ پرویز

میرے بزرگو! اپنی جانی پہچانی بیٹی کا سلام لو!

میری بہن نے کہا ہے کہ اگر غالبؔ آج زندہ ہوتا اور ہمارے دور کے آدمیوں کو دیکھتا تو نہ معلوم وہ کیا کہتا! میں بتاتی ہوں کہ وہ کیا کہتا! میری بہن نے مثالیں جانوروں کی دی ہیں۔ میں بھی انہیں کے حوالے سے بات سمجھاؤں گی۔

ہم کراچی میں تھے تو ہماری ایک سہیلی کے مکان کے متصل، ایک مولوی صاحب کا مکان تھا۔ ایک دن اُنکے یہاں بیٹھی تھی کہ ساتھ والے مکان سے اونچے اونچے بولنے کی آواز آئی۔ مولوی صاحبان چونکہ اکثر وعظ کہتے رہتے ہیں،

اس لئے وہ عام باتیں بھی لاؤڈ سپیکرانہ انداز میں کہنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ وہ بیوی سے باتیں کر رہے تھے لیکن یہ بھول گئے کہ وہ ممبر پر نہیں صحنِ خانہ میں ہیں — وہ اپنی بیگم صاحبہ سے کہہ رہے تھے۔ سنو بی بی! شریعتِ حقہ کی رُو سے تمہارا نان نفقہ تو میرے ذمے ہے بیماری کا خرچ نہیں۔ بیمار رہنا ہے تو میکے جاؤ — چنانچہ ایک آدھ ماہ کے بعد میں نے سن لیا کہ انہوں نے بیوی کو اس جرم میں کہ وہ اکثر بیمار رہتی ہے طلاق دے دی۔ اور اس کی جگہ ایک نئی بیوی لے آئے جس کے نکاح نامہ میں غالباً لکھوا لیا ہوگا کہ وہ کبھی بیمار نہیں پڑے گی۔

میں اس وقت چھوٹی سی تھی لیکن میرے دل پر اس واقعہ کا بڑا گہرا اثر تھا۔ اس کے بعد ایک کنونشن میں باباجی نے اپنے خطاب میں (T.C. HUDSON) کی نہایت دلچسپ کتاب (BIRDS AND MAN) کا ذکر کیا۔ اس میں اس نے پرندوں کی زندگی کا مشاہدہ کرکے بڑے دلچسپ واقعات قلمبند کئے ہیں۔ ان میں ایک واقعہ یہ تھا کہ اس نے ایک جگہ دیکھا کہ پرندوں کا ایک جھنڈ اڑ گیا ہے اور پیچھے دو پرندے رہ گئے ہیں۔ ان میں سے ایک پرندہ زمین پر چلتا تھا اور دوسرا فضا میں اڑتا۔ اڑنے والا پرندہ پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتا اور چلنے والے پرندے کو آواز دیتا لیکن جب وہ اپنی رفتار میں تیزی نہ کرتا تو وہ بھی نیچے اتر آتا۔ تاآنکہ پیچھے رہ جانے والا پرندہ اس کے ساتھ آملتا۔ اس کے بعد وہ پھر اڑتا۔ وہ دونوں اس طرح اُفتاں و خیزاں اپنی منزل کی طرف بڑھتے چلے جاتے۔ مسٹر ہڈسن نے قریب جا کر دیکھا تو ان میں سے ایک نر تھا اور دوسری مادہ۔ مادہ کا ایک بازو ٹوٹا ہوا تھا اس لئے وہ اڑنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ نر اُسے تنہا چھوڑ کر اکیلا نہیں جانا چاہتا تھا۔ اس لئے کہ وہ اس کی رفیقۂ حیات تھی۔

میں نے یہ واقعہ سنا تو مذکورہ مولوی صاحب یاد آ گئے۔ بیساختہ گالی دینے کو جی چاہا۔ لیکن رک گئی کہ نہ، وہ تو اشرف المخلوقات ہیں!

اسی خطاب میں باباجی نے مہاجر پرندوں کا بھی ذکر کیا۔ انہوں نے بتایا کہ بحرالکاہل میں بہت سے جزیرے ہیں جہاں خاص قسم کے پرندوں کے سوا کوئی جاندار نہیں ملتا۔ یہ پرندے سردی کے موسم میں جزائر ہوائی میں چلے جاتے ہیں۔ انہیں یہ دو ہزار تین سو میل کا سفر ایک ہی اڑان میں کرنا ہوتا ہے۔ وہ وہاں انڈے دے کر واپس آ جاتے ہیں۔ اس کے بعد جب ان کے بچے اڑنے کے قابل ہو جاتے ہیں تو وہ اپنے ماں باپ کے نقشِ قدم پر (یعنی ان نقوشِ قدم پر جن کا کوئی نشان نہیں ہوتا) سیدھے وہیں پہنچ جاتے ہیں جہاں سے ان کے ماں باپ آئے تھے۔

باباجی یہ بیان کر رہے تھے اور میرے پیچھے دو صاحبزادگان کچھ کھسر پھسر کر رہے تھے۔ میں نے کان لگا کر سنا تو وہ کہہ رہے تھے کہ موقعہ اچھا ہے۔ لوگ منہمک بیٹھے ہیں چلو باہر جا کر کسی کی سائیکل چرائیں۔ وہ اٹھ کر چلے گئے تو میں نے دیکھا کہ وہ دو بھائی تھے اور اس باپ کے بیٹے جس کی شرافت، دیانت، امانت ضرب المثل تھی۔

میں کبھی ان پرندوں کے بچوں کو ذہن میں لاتی جو اپنے ماں باپ کی ساری خصوصیات اپنے اندر سموئے ہوئے تھے اور کبھی اس اشرف المخلوقات کی اولاد کو۔ بات میری سمجھ سے باہر تھی۔

اس خطاب میں باباجی نے سالمن مچھلی کے متعلق بتایا کہ وہ اپنی جائے پیدائش سے نکل کر مختلف راستے طے کرتی، دور سمندر میں چلی جاتی ہے۔ کچھ عرصہ وہاں گزار کر واپسی کا رُخ کرتی ہے اور سمندر سے اسی دریا میں پہنچ جاتی ہے جس سے وہ سمندر میں داخل ہوئی تھی۔ اس دریا سے اس معاون ندی کا رُخ کر لیتی ہے جو اسے دریا میں لائی تھی اور اس

ندی سے پھر اپنی رہائش گاہ میں جا پہنچتی ہے۔ اگر آپ اسے راستے میں پکڑ کر کسی غلط ندی میں چھوڑ دیں تو وہ آگے بڑھنے کے بجائے فوراً پیچھے لوٹ کر بڑے دریا میں پہنچ جاتی ہے اور وہاں سے صحیح ندی میں داخل ہو جاتی ہے۔ وہ اس میں کبھی غلطی نہیں کرتی۔

صبح کو ہم نے یہ بات سنی اور شام کو گلی میں شور اٹھا کہ پکڑ لو۔ پکڑ لو۔ جانے نہ پائے۔ معلوم ہوا کہ حاجی صاحب کا صاحبزادہ ہے جو چوری کے جرم میں تین بار جیل یاترا کر چکا ہے۔ ابھی پرسوں چھوٹ کر آیا تھا کہ آج مسجد کا کلاک چراتے ہوئے پکڑا گیا۔ میں نے سوچا کہ سامن مچھلی کو اگر کوئی زبردستی غلط راستے پر ڈال دے تو وہ منہ موڑ کر خود بخود سیدھی راہ اختیار کر لیتی ہے اور یہ آدمی کیسے ہیں کہ مار مار کر سیدھے راستے پر ڈالا جاتا ہے اور وہ پھر غلط راستے پر چل نکلتے ہیں۔

اور آخر میں مجھے ماتنگی یاد آ گیا۔ یہ ہمارا کتا تھا۔ اسے کتا کہتے ہوئے مجھے ندامت محسوس ہوتی ہے حقیقت یہ ہے کہ یہ بھی ابن آدم کی کم ظرفی نہیں تو کم از کم حسد و انتقام کا جذبہ ضرور ہے جو اس نے کتے جیسے وفا شعار جانور کو اس قدر ذلیل اور قابل نفرت قرار دے رکھا ہے۔ میں تو کبھی سوچتی ہوں کہ یہ بات غیر شعوری طور پر اس حقیقت کی غماز تو نہیں کہ ابن آدم کے نزدیک وفاداری ہے ہی ذلیل لوگوں کا شعار! آج تو کچھ ایسا ہی سمجھا جاتا ہے۔ بہرحال بات ہو رہی تھی ماتنگی کی۔ اس کی کیفیت یہ تھی کہ ہم رات کو اطمینان کی نیند سوتے اور وہ چاروں طرف پہرہ دیتا۔ پہچان کا یہ عالم کہ وہ پاؤں کی چاپ سے اپنے اور بیگانے میں تمیز کر لیتا۔ اور پھر کیا مجال کہ کوئی بیگانہ مکان کی چار دیواری کے قریب بھی پھٹکنے پائے۔ خواہ وہ انسان ہو یا خود اس کا ہم جنس کتا۔ اس کا معیار یہ تھا کہ جو اپنے گھر کا نہیں وہ بیگانہ ہے اور کوئی بیگانہ اس گھر میں قدم نہیں رکھ سکتا۔ اور اس نے ایک رات لڑتے لڑتے جان دیدی لیکن بیگانے کتے کو دروازے کے اندر قدم نہ رکھنے دیا۔

وہ تو کتا تھا جس نے اپنے گھر کی حفاظت کے لئے جان دے دی، اور اس ملک میں وہ آدمی بستے ہیں جو دشمنوں کو اپنے گھر بلا کر قوم کی متاع حیات اُن کے حوالے کرنے کی سازشیں کرتے ہیں اور لیڈر کہلاتے ہیں۔ گرفتار ہو جاتے ہیں تو بنگلوں میں رہتے ہیں اور باہر اُن کے ہمنوا شور مچاتے ہیں کہ جیل کے دروازے کھول دو۔ انہیں رہا کر دو۔ ناموسِ ملت کے ان رہزنوں سے پوچھو کہ کیا تم نے کبھی چڑیا گھر کے چوکیداروں سے بھی کہا ہے کہ آج رات بھیڑیوں، چیتوں اور شیروں کے پنجروں کے دروازے کھول دو! اور طرفہ تماشہ یہ کہ وہ قوم اور ملک کو بیچنے والے بھی آدمی کہلاتے ہیں اور ان غداروں کو چھڑانے کی کوششیں کرنے والے بھی آدمی۔ یعنی وہ آدمی جنہیں دیکھ کر تو نیچ بھی شرم سے گردن جھکا لے۔

بزرگان گرامی قدر! آپ نے حیوانوں کی خصلتوں کا بھی مطالعہ کر لیا اور انسانوں کی کرتوتیں بھی سن لیں۔ غالب نے اپنے زمانے کے لوگوں کو دیکھ کر کہا تھا۔

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا!

وہ اگر آج زندہ ہوتا تو اس دور کے آدمیوں کو دیکھ کر اس کے سوا اور کیا کہتا ؎

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

———— (۹) ————

(۱۵)

عالیہ سرور

محترم صدر صاحب۔ پیارے بابا جی ۔ اور معزز حاضرین!

میں نہایت ادب سے آپ کی خدمت میں سلام عرض کرتی ہوں اور اس کے بعد اپنے چھوٹے منہ سے ایک بڑی بات کرنے کی اجازت چاہتی ہوں۔ آج سے تقریباً دو سال پہلے جب میں دوسری جماعت میں پڑھتی تھی، اس وقت میرے ابّو اور امی طلوعِ اسلام کالج کا گھر میں اکثر ذکر کیا کرتے تھے۔ میں ان کی باتیں سنتی رہتی تھی اور وقت میں اپنے ننھے دماغ سے اس کالج کے متعلق جو اندازہ لگا سکی وہ یہ تھا کہ یہ ایک ایسا کالج ہوگا جس میں بچے پڑھ کر اپنی زندگی کے تمام معاملات میں اللہ میاں کی کتاب یعنی قرآن پاک سے رہنمائی حاصل کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔ میں نے اپنے ابّو سے کہا کہ آپ مجھے بھی اس کالج میں داخل کروا دیجئے میرا دل چاہتا تھا کہ میں اس کالج میں جلد از جلد چلی جاؤں۔ لیکن میں اس کالج میں جانے کے لئے جتنی جلدی میں تھی، کالج بننے میں اتنی ہی دیر تھی۔ میرے ابّو نے مجھے بتایا کہ پہلے ہم سب کو بابا جی کے ساتھ مل کر کئی کام کرنے ہیں پھر کہیں وہ کالج بننا ہے۔ سب سے پہلے تو اس کے لئے بہت سارے پیسوں کی ضرورت ہے۔ لہٰذا میں نے اللہ میاں سے دعا مانگی۔ اللہ میاں میرے پاس بہت سارے پیسے ہوں تو میں بابا جی کو دے دوں اور کہوں کہ یہ کالج جلدی سے بنوا دیں۔ انہی دنوں میرے ابّو نے مجھے ایک منی باکس لا کر دیا تھا۔ مجھے جو پیسے خرچ کرنے کے لئے ملتے، میں ان میں سے کچھ پیسے بچا کر منی باکس میں ڈالتی رہی اس بات کو ڈیڑھ سال سے زیادہ عرصہ گذر گیا ہے۔ اب جب میں نے اپنا منی باکس کھولا تو میری یہ ساری بچت ڈیڑھ سو روپیہ ہو گئی تھی۔ میں نے اپنے ابّو سے کہا کہ اب آپ مجھے بابا جی کے پاس لے چلیں تاکہ میں یہ پیسے کالج فنڈ میں جمع کروا دوں اور آپ سب لوگوں سے درخواست کروں کہ اگر آپ اسی طرح کوشش کریں تو یہ کالج بہت ہی جلد شروع ہو سکتا ہے اور میرے جیسی کئی بہن بھائیوں کی بہتری ہو سکتی ہے اور وہ صحیح معنوں میں مسلمان بن سکتے ہیں۔ شکریہ! والسلام!

محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن کریم

لاہور میں

ہر اتوار ——— صبح نو بجے

بمقام

۲۵/بی۔ گلبرگ (۲) ——— لاہور

ادارہ طلوعِ اسلام۔ ٹیلیفون نمبر (۸۰۰۸۰)

کراچی میں

ہر اتوار ——— (بذریعہ ٹیپ) ——— صبح ۹½ بجے

بمقام: دفتر بزمِ طلوعِ اسلام۔ ۱۱۔ فردوس مارکیٹ (بالمقابل بس سٹاپ) پہلی چورنگی۔ ناظم آباد۔ کراچی ۱۸

ٹیلیفون نمبر (۶۱۰۴۶۸)

حقائق و عبر

۱۔ یہی بات ہم کہیں تو کافر

ماہنامہ میثاق (لاہور) کی مئی ۱۹۷۲ء کی اشاعت میں مفتی محمد شفیع صاحب کی روایت سے مولانا محمود الحسن صاحب سے متعلق حسبِ ذیل واقعہ شائع ہوا ہے۔ مفتی صاحب نے فرمایا:۔

> مالٹا کی قید سے واپس آنے کے بعد ایک رات مولانا محمود الحسن بعد عشاء دار العلوم میں تشریف فرما تھے۔ علماء کا بڑا مجمع سامنے تھا۔ اس وقت فرمایا "ہم نے تو مالٹا کی زندگی میں دو سبق سیکھے ہیں" یہ الفاظ سنکر سارا مجمع ہمہ تن گوش ہو گیا کہ اس استاد العلماء درویش نے اسی سال علماء کو درس دینے کے بعد آخر عمر میں جو سبق سیکھے ہیں وہ کیا ہیں؟ فرمایا "میں نے جہاں تک جیل کی تنہائیوں میں اس پر غور کیا کہ پوری دنیا میں مسلمان دینی اور دنیوی حیثیت سے کیوں تباہ ہو رہے ہیں تو اس کے دو سبب معلوم ہوئے۔ ایک ان کا قرآن چھوڑ دینا، اور دوسرے آپس کے اختلافات اور خانہ جنگی۔ اس لئے میں وہیں سے یہ عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی اس کام میں صرف کروں کہ قرآن کریم کو لفظاً اور معناً عام کیا جائے۔ بچوں کے لئے لفظی تعلیم کے مکاتب بستی بستی قائم کئے جائیں۔ بڑوں کو عوامی درسِ قرآن کی صورت میں اس کے معانی سے روشناس کرایا جائے اور قرآنی تعلیمات پر عمل کے لئے آمادہ کیا جائے اور مسلمانوں کی باہمی جنگ و جدال کو کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے۔

اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد مفتی صاحب نے لکھا ہے۔

> آج بھی مسلمان جن بلاؤں میں مبتلا اور جن حوادث و آفات سے دوچار ہیں اگر بصیرت سے کام لیا جائے تو ان کے سب سے بڑے سبب یہی دو ثابت ہوں گے۔ قرآن کو چھوڑنا اور آپس میں لڑنا۔ غور کیا جائے تو یہ آپس کی لڑائی بھی قرآن کو چھوڑنے ہی کا لازمی نتیجہ ہے۔ قرآن پر کسی درجے میں بھی عمل ہوتا تو خانہ جنگی یہاں تک نہ پہنچتی۔

طلوعِ اسلام پاکستان میں پچیس سال سے یہی بات کہتا چلا آ رہا ہے لیکن اس پر انہی حضرات کی طرف سے کفر کے فتوے لگائے جاتے ہیں!

۲۔ ایک اور مفتی صاحب

سرحد کے وزیرِ اعلیٰ مفتی محمود صاحب نے فرمایا کہ سرحد میں ایک آرڈیننس جاری کیا جا رہا ہے جس کی رو سے حکومت جس کی نجی املاک چاہے بلا معاوضہ اپنے قبضے میں لے سکے گی۔ سوال کرنے پر انہوں نے کہا کہ یہ آرڈیننس اسلام کے عین مطابق

ہے۔ دوسرے تیسرے ہی دن اُنہی مفتی صاحب کی جمعیت کی مجلس شوریٰ نے جس میں خود مفتی صاحب بھی تشریف فرما تھے، یہ ریزولیوشن پاس کیا کہ مجوزہ آرڈیننس اسلام کے یکسر خلاف ہے، اسے واپس لیا جائے۔ معلوم نہیں وہ آرڈیننس جاری ہوا ہے یا اسے روک دیا گیا ہے لیکن اس ایک واقعہ سے اندازہ لگائیے کہ ہمارے ان مفتیانِ کرام کے فتووں کی حیثیت کیا ہے اور اسلام کے متعلق ان کا مبلغ علم کس قدر!

۳۔ مفتی صاحب کا ایک اور آرڈیننس

روزنامہ جسارت (کراچی) کی اشاعت بابت ۱۸ ستمبر ۱۹۷۲ء میں حسبِ ذیل خبر شائع ہوئی ہے۔

وزیر اعلیٰ مفتی محمود نے آج یہاں ایک استقبالیہ سے خطاب کرتے ہوئے انکشاف کیا کہ وہ واپس جا کر احترامِ رمضان کے لئے ایک آرڈیننس جاری کریں گے جس کی رُو سے عوامی مقامات مثلاً سڑکوں، ہوٹلوں، کلبوں، اسٹیشنوں وغیرہ پر اگر کوئی شخص رمضان کے دنوں میں روزے کے اوقات میں کھاتا پیتا پایا گیا تو اسے تین مہینے قید کی سزا دی جائے گی۔ انہوں نے نعروں کی گونج میں اعلان کرتے ہوئے کہا کہ اب تک اس آرڈیننس کا مسودہ تیار ہو گیا ہوگا اور میں واپس جاتے ہی اس پر دستخط کر دوں گا۔ انہوں نے کہا کہ میں کراچی والوں کو پہلے سے خبردار کر رہا ہوں کہ جب وہ سرحد آئیں تو سفر کے باوجود روزہ رکھیں ورنہ رات کو آ کر صبح کو نکل جائیں۔

معلوم نہیں یہ آرڈیننس جاری ہوا ہے یا اس کا حشر بھی مقدم الذکر آرڈیننس جیسا ہو گیا۔

۴۔ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ

ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی (اسلام آباد) کے ترجمان ماہنامہ فکر و نظر کی مئی ۱۹۷۲ء کی اشاعت میں شرف الدین اصلاحی صاحب کے قلم سے سندھ کے مشہور بزرگ، شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے متعلق ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں:-

شاہ صاحب نے عہدِ شباب میں قدم رکھا ہی تھا کہ ان کے ساتھ ایک ایسا سانحہ پیش آیا جس کی بدولت کئی سال تک جنگلوں اور بیابانوں کی خاک چھاننی پڑی۔ شاہ صاحب کے والد شاہ حبیب جس زمانے میں کوٹری میں سکونت پذیر تھے، مرزا مغل بیگ ارغون کا معزز خاندان ان کے ارادتمندوں میں شامل ہو گیا۔ شاہ حبیب کی بزرگی اور پاکبازی سے مرزا مغل بہت متاثر تھا۔ مرزا کے گھرانے میں سخت پردے کا رواج تھا۔ مگر شاہ حبیب کے لئے یہ رسم بالکل ختم کر دی گئی تھی۔ گھر کی تمام خواتین بے تکلف ان کے سامنے ہوتی تھیں۔ اگر جب کوئی بیمار ہوتا، دعا تعویذ کے لئے شاہ صاحب کو بلایا جاتا۔ ایک بار مرزا مغل بیگ کی نوجوان لڑکی بیمار پڑی۔ اتفاق سے شاہ حبیب ان دنوں خود ذی فراش تھے۔ اس لئے جب بلاوا آیا تو اپنے نوجوان بیٹے شاہ لطیف کو بھیج دیا۔ مرزا کو پہلے تو تامل ہوا مگر پھر اس خیال سے کہ مرشد زادہ ہے بیٹی کا سامنا کراتے ہی بنی۔ شاہ لطیف مریضہ کا علاج کرنے آئے تھے خود بیمار ہو گئے۔ اس پری تمثال کو دل دے بیٹھے۔ یہ بات چھپنے والی نہ تھی اور آخر کار شاہ حبیب کو اپنے اہل و عیال سمیت کوٹری سے نقل مکانی کرنا پڑا۔ نوجوان لطیف کا عشق حدِ جنون تک پہنچ گیا۔ دل کے درد نے انہیں ایک جگہ آرام سے نہ بیٹھنے دیا۔ وہ گھر بار چھوڑ، سر بصحرا نکل گئے اور مسلسل تین سال تک حالتِ دیوانگی میں دشت نوردی کرتے رہے ۔۔۔ عشقِ مجازی عشقِ حقیقی کا زینہ ہے۔ ہر سالک کو اس منزل سے گذرنا پڑتا ہے۔

ہمیں شاہ عبداللطیف بھٹائی کے کوائف حیات کے متعلق زیادہ واقفیت حاصل نہیں۔ کیا کوئی جاننے والے صاحب فرمائینگے کہ مندرجہ صدر واقعہ کی تاریخی حیثیت کیا ہے۔ صاحب مقالہ نے اس کی سند میں کوئی حوالہ نہیں دیا۔

۵۔ خان عبدالغفار خان کا پختونستان

روزنامہ امروز (لاہور) کی ۱۹ ستمبر ۱۹۶۹ء کی اشاعت میں مرغوب صدیقی صاحب کے قلم سے ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے ان خطوط کو درج کیا ہے جو تقسیم ہند کے زمانے میں خان عبدالغفار خاں نے مختلف مشاہیر کو لکھے تھے۔ یہ خطوط (بقول مقالہ نگار) ان سرکاری مسودات میں شامل ہیں جو بھارت میں انگریزوں کے اختیارات کی منتقلی سے متعلق شائع ہوئے ہیں۔

خان صاحب موصوف نے ایک خط ۱۱ جون ۱۹۴۷ء کو مسٹر گاندھی کو لکھا جس میں کہا گیا کہ:۔

> آج تمام صوبہ سرحد کی کانگریس کمیٹی، کانگریس کی پارلیمانی پارٹی اور خدائی خدمتگاروں کا ایک اجلاس ہوا جو چار گھنٹے جاری رہا۔ صوبہ بھر سے تمام نمائندوں نے اس میں حصہ لیا۔ اس اجلاس کی عام رائے یہ تھی کہ ہم برطانوی منصوبے کے پیراگراف چار کے تحت استصواب رائے میں حصہ نہ لیں۔ یہ تمام لوگ چاہتے تھے کہ استصواب رائے اس امر پر ہو کہ صوبہ سرحد پاکستان کا حصہ ہو یا وہاں ایک آزاد پٹھان مملکت قائم ہو۔

خان صاحب موصوف نے ۱۲ جون ۱۹۴۷ء کو ایک خط قائداعظم کو بھی لکھا جس میں انہوں نے لکھا کہ:۔

> اسی دن بنوں میں سرحد کی صوبائی کانگریس کمیٹی، خدائی خدمتگاروں اور زلمے پختون کے اراکین کا ایک مشترکہ اجلاس ہوا جس میں یہ متفقہ فیصلہ کیا گیا کہ تمام پختونوں پر مشتمل آزاد مملکت قائم کی جائے۔ اس اجلاس نے تمام پٹھانوں سے اپیل کی کہ وہ اپنے اس ہر دلعزیز مقصد کے حصول کے لئے متحد ہو جائیں اور کسی قسم کے غیر پختون غلبہ کے سامنے ہرگز سر نہ جھکائیں۔

اس کے بعد ۲۸ جون ۱۹۴۷ء کو کانگریس کے صدر اچاریہ کرپلانی نے وائسرائے ہند لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو ایک خط کے دوران لکھا کہ سرحد کا اصل مسئلہ کسی ہندو مسلم تنازعہ کو طے کرنا نہیں تھا بلکہ یہ تھا کہ سرحد میں کسی طرح ایک آزاد پٹھان مملکت قائم کی جائے۔ اس کے بعد ۲۹ جون ۱۹۴۷ء کو مسٹر گاندھی نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو لکھا کہ انہیں خان عبدالغفار خاں نے لکھا تھا کہ چونکہ وہ ایک آزاد پٹھان مملکت کے وجود میں لانے کے سلسلہ میں ناکام رہے تھے، لہٰذا وہ استصواب رائے میں حصہ نہیں لینگے۔ اس کے بعد ۵ جولائی ۱۹۴۷ء کو مسٹر گاندھی نے خان عبدالغفار خان کو ایک خط کے دوران لکھا جسے وائسرائے کے نام بھیجا گیا تھا کہ خدائی خدمتگار استصواب رائے کے دوران کوئی ہنگامہ کریں لیکن خدائی خدمتگار استصواب رائے میں کوئی حصہ نہ لیں۔ کیونکہ جہاں تک ان کے داخلی امور کا تعلق ہے ان کو یہ مطالبہ کرنے کا حق ہے کہ ان کو ایسی خودمختاری حاصل ہو جس میں بھارت اور پاکستان مداخلت نہ کر سکیں۔ اور جہاں تک بھارت اور پاکستان میں سے ایک کو منتخب کرنے کا تعلق ہے یہ فیصلہ وہ اسوقت ہی کریں جب نہ صرف بھارت اور پاکستان کے آئین بن جائیں بلکہ سرحد کے لوگ بھی اپنا علیحدہ خودمختاری پر مبنی آئین تیار کرلیں۔

یہ تھے خان عبدالغفار خان کے خیالات اور ان کی سرگرمیاں اس وقت جب انگریز اور ہندو دونوں قیام پاکستان پر راضی ہو چکے تھے۔

(۰)

۶۔ پنجاب کیطرف سے (خود وضع کردہ موہوم) خطرہ

خان عبدالولی خان نے لندن میں سنڈے ٹائمز کے نامہ نگار کو انٹرویو دیتے ہوئے گزشتہ ستمبر میں کہا تھا:۔

بلوچستان اور سرحد کو پنجاب کی طرف سے معاشی اور سیاسی غلبہ کا حقیقی خطرہ ہے۔ یہی وہ خطرہ ہے جس کی بنا پر ہماری پارٹی زیادہ سے زیادہ صوبجاتی "خود مختاری" کا مطالبہ کرتی ہے۔ (پاکستان ٹائمز ۲۳ ۹/۷۲)

اس کے ایک ہی دن پہلے مرکزی اسمبلی میں چوہدری ظہور الٰہی صاحب کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے، مرکزی وزیر مسٹر جے۔ اے۔ رحیم نے ایوان کو بتایا کہ ویسٹ پاکستان انڈسٹریل ڈیولپمنٹ کارپوریشن کے ڈائریکٹرز میں سے ایک سندھی ہے، ایک بلوچستانی اور ایک صوبہ سرحد سے متعلق۔ اس میں پنجابی ڈائریکٹر کوئی نہیں۔ اس کارپوریشن کے دیگر افسروں کے متعلق حسب ذیل اعداد و شمار ایوان میں پیش کئے گئے۔

سینئر افیسرز:- سندھ (۴۲ فیصد)۔ پنجاب (۴۷ فیصد)۔ صوبہ سرحد (۷ فیصد) اور بلوچستان (۴ فیصد)

جونئیر افیسرز:- سندھ (۴۹ فیصد)، پنجاب (۳۸ فیصد)۔ صوبہ سرحد (۹ فیصد)۔ اور بلوچستان (۴ فیصد)

ہیڈ آفس میں کلاس II۔ سندھ (۵۶ فیصد)۔ پنجاب (۳۵ فیصد)، صوبہ سرحد (۵ فیصد)، بلوچستان (۴ فیصد)

ہیڈ آفس میں کلاس III۔ سندھ (۳۱ فیصد)، پنجاب (۲۷ فیصد)۔ صوبہ سرحد (۲۳ فیصد)، بلوچستان اور آزاد کشمیر وغیرہ (۱۹ فیصد)

واضح رہے کہ پنجاب کی آبادی (۶۲) فیصد ہے۔ یہ ہے اس وقت "پنجاب کے غلبہ" کی حالت۔

(۰)

۶- پاکستان کے "بڑے لوگ"

بلوچستان کے سرداروں کا شمار پاکستان کے "بڑے لوگ" میں ہوتا ہے۔ ان "بڑے لوگوں" کے باہمی تعلقات کس قسم کے ہیں، اس کی ایک خفیف سی جھلک اس رپورٹ سے لگ سکتی ہے جو کراچی کے اخبار حیاتِ ریت کی ۵ اکتوبر ۷۲ء کی اشاعت میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ

جھالاوان کے چیف سردار دودا خان، میر نبی بخش زہری، اور سردار محمد اکبر بگٹی کے صاحبزادہ سلیم اکبر بگٹی نے گورنر بزنجو کو پاکستان دشمن قرار دیتے ہوئے، صدر بھٹو سے مطالبہ کیا ہے کہ ان کو برطرف کر کے بلوچستان میں غیر سرکاری گورنر مقرر کیا جائے۔ سردار دودا خان نے کہا کہ ہمارے اسلحہ کی قوت پر ہی بزنجو آج گورنری کی کرسی پر براجمان ہے ..... میں بزنجو کو خبردار کرنا چاہتا ہوں کہ اگر میرے خاندان کا ایک فرد بھی لیویز یا پولیس کے ذریعے مروایا گیا تو بزنجو یاد رکھے کہ وہ جھالاوان میں رہتا ہے، آسمان پر نہیں رہتا..... انہوں نے الزام لگایا کہ بزنجو عید کے روز دو آدمیوں کو مسجد میں قتل کر چکا ہے اور اب اس نے (۲۵) آدمیوں کے قاتل اور میرے دشمن جعفر خان کو ایک سو لیویز کا افسر انچارج بنا کر میرے علاقے میں دہشت گردی پھیلانے کے لئے بھیجا ہے۔ سردار دودا خان نے کہا کہ بزنجو نے مجھ پر نبی بخش زہری سے پیسے لینے کا الزام لگایا ہے۔ زہری تو میرے قبیلہ کا آدمی ہے۔ اگر میں اس سے پیسے لوں تو اس میں کیا حرج ہے۔ لیکن گورنر بزنجو کو اس پر شرم نہیں آتی کہ وہ اسمٰعیلی فرقہ کے سرمایہ دار، امیر علی فینسی سے پیسے لے رہا ہے۔ جہاں تک اسلحہ کا تعلق ہے تو اگرچہ میرا جسم چھوٹا ہے لیکن میرے پاس باپ دادا کے زمانے سے اسلحہ چلا آ رہا ہے۔

اس پر تبصرہ کرتے ہوئے، بلوچستان کے رہنما میر عبدالباقی بلوچ نے خدشہ ظاہر کیا ہے کہ سندھ میں "حُر مجاہدین" اور بلوچستان میں جھالاوان قبائل کو مشتعل کرنا ایک گہری بین الاقوامی سازش کا نتیجہ نظر آتا ہے۔ اس کے پیچھے روس کا اور برطانیہ کا ہاتھ کارفرما دکھائی دیتا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ

ان سب حالات کی روشنی میں، اس قوم سرپا کا جو نقشہ مجھے دکھائی دے رہا ہے وہ یہ ہے کہ بھارت بظاہر کشمیر میں فوجی چھیڑ چھاڑ تیز کر دیگا تاکہ ہماری زیادہ افواج اس طرف چلی جائیں اور پھر یک لخت سندھ پر بھرپور حملہ کر کے ریلوے لائن تک قبضہ جمانا چاہیگا تاکہ پنجاب اور کشمیر میں ہماری افواج کو ہماری واحد بندرگاہ کراچی سے فوجی ساز و سامان کی ترسیل کی کوئی صورت نہ رہے۔ اور دوسری جانب اسی دوران نیپ کا حمایتی افغانستان روس کی مدد سے بلوچستان پر یہ کہہ کر حملہ کر دے کہ بلوچستان میں انتشار کی وجہ سے افغانستان کی سالمیت کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے جس کے لئے وجہ جواز پیدا کرنے کی خاطر بزنجو صاحب اپنی لیویز کے دستے بھی عبالا وال بھیج رہے ہیں۔ (جسارت، کراچی۔ ۶ر اکتوبر ۷۱ء)

۷۔ گڑ وڈی پائی

ہمارے ایک دوست نے شادی کے دعوت نامہ کا ایک مرصع کارڈ، ہماری تفریح طبع کے لئے بھیجا ہے۔ اس میں آپ بھی شریک ہو جائیے۔ کارڈ پر لکھا ہے۔

مُنجے سجنوں تے متر و ...... شالا تُسیں رب دیاں رحمتاں تلے پھلو تے پھُلو۔

ساڈے لاڈلے پُتر ..... دا ویاہ، لاڈلی دھی ..... دے نال ...... ہوناایں۔ تُسیں وی خوشیاں وِچ رل کے تے دعاواں دی سانجھ پا کے ساڈا مان تے پت ودھاؤ۔

آیاں اگے اکھیاں وچھان والے ......

اس کے بعد ہے:۔ ویلے دی وَنڈ ...... سہرے دیاں لڑیاں سجان دا ویلا ..... جنج دے ٹرن دا ویلا۔

شاہکار ہے:۔ لاڑے وَنوں آن پائی۔ (آگے تاریخ لکھی ہے)۔ اس کے بعد ہے:۔ کھان پین دا ویلا۔

یہ دعوت نامہ دیار صاحب امرتسر سے موصول نہیں ہوا۔ پاکستان ہی سے آیا ہے۔

ہماری قوم بھی عجیب ہے۔ افراط کی طرف جائے گی تو ..... "معلی الالقاب، قاضی الحاجات ..... اسال ہمارے کشت زار پر تقاطر الامطار نہیں ہوا" لکھے گی۔ اور تفریط کی طرف جائے گی تو ولیمہ کی بجائے "لاڑے وَنوں آن پائی" کہے گی! ــــ اسے "کوسے یار سے نکل کر دار تک" راستے میں کوئی مقام ہی نہیں ملتا۔

۸۔ واقعی خبر

صحافتی دنیا میں کہا جاتا ہے کہ اگر کتا آدمی کو کاٹ لے تو یہ کوئی خبر نہیں، لیکن اگر کبھی آدمی کتے کو کاٹ کھائے تو یہ واقعی خبر ہوتی ہے۔ اسی قسم کی ایک واقعی خبر "بنگلہ دیش" ریڈیو نے نشر کی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ

عالمگیر امن کونسل (ورلڈ پیس کونسل) نے شیخ مجیب الرحمٰن کو بین الاقوامی امن کا تمغہ (AWARD) عطا کیا ہے۔ (ڈان۔ ۱۲ر اکتوبر ۷۱ء)

ہے نال خبر ــــ !!

نقد و نظر

۱۔ نظامِ زکوٰۃ اور جدید معاشی مسائل

مصنف۔ محمد یوسف گورایہ صاحب، رکن ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد۔

شائع کردہ:۔ ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد۔ صفحات:۔ ۱۶۸، قیمت مجلّد۔ پانچ روپے پچاس پیسے۔

ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد پر اب تک غریب پاکستانی عوام کی ایک کروڑ سے زاید گاڑھے پسینے کی کمائی صرف ہو چکی ہے لیکن اس دس بارہ سال کے عرصہ میں اس نے ان غریب عوام کی رہنمائی کے لئے وقت کے سب سے اہم مسئلہ یعنی زمانہ جدید کی روشنی میں اسلام کے معاشی یا مالیاتی نظام کے بارے میں کوئی کتاب تو درکنار ایک کتابچہ بھی پیش نہیں کیا۔ پچھلے تین چار سال سے ملک میں "اسلامی سوشلزم" پر گرما گرم بحث جاری ہے۔ کوئی اسے اسلامی نظام معاشیات کے عین مطابق قرار دیتا ہے اور کوئی اسکے ڈانڈے کفر سے جا ملاتا ہے۔ غرضیکہ ہر طبقۂ فکر کے اہلِ علم نے اس پر کسی نہ کسی رنگ میں اظہار خیال کیا ہے لیکن قربان جایئے ادارہ تحقیقات اسلامی کے، کہ جن کروڑوں عوام کے خون پر یہ پل رہا ہے، اس کے سامنے ان کے دین و ایمان کا فیصلہ ہوتا رہا اور یہ چین کی نیند سوتا رہا۔ مقامِ شکر ہے کہ آخر کار اس نے اپنی مہرِ سکوت کو توڑا ہے اور "نظامِ زکوٰۃ اور جدید معاشی مسائل" کے نام سے زیرِ تبصرہ کتاب پیش کی ہے۔

جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے، اس میں اسلام کے نظامِ زکوٰۃ سے بحث کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ حکومت پاکستان خود اسے وصول کر کے ملک کے دفاع، بے کاری کے خاتمے، کسانوں کی حالت بہتر بنانے، طبی اور تعلیمی سہولتیں عام کرنے (خاص کر دیہات میں) پر خرچ کرے۔ ادارہ کے پاس ملک کی سب سے شاندار مذہبی لائبریری ہے اور اس کے اراکین کو تحقیق کی ہر قسم کی سہولتیں حاصل ہیں۔ لیکن اس کتاب میں کس طرح دادِ تحقیق دی گئی ہے، قابلِ غور ہے۔ جدید معاشی مسائل سے عام طور پر ذہن سود، تجارتی قرضوں، انشورنس اور خاندانی منصوبہ بندی کی طرف جاتا ہے لیکن کتاب کھولنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان مسائل کو چھوا تک نہیں گیا۔ اس کے برعکس انہی مسائل کو جو قدیم زمانے سے چلے آتے ہیں یعنی ملکی دفاع، کسانوں کی حالت بہتر بنانے، طبی اور تعلیمی سہولتوں کو جدید معاشی مسائل کے رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔

زکوٰۃ کی وصولی کا حق

زکوٰۃ کی وصولی کا حق کسے حاصل ہے؟ اس پر فاضل مصنف نے لمبی چوڑی بحث کے بعد جو نتیجہ نکالا ہے، اسے خود انہی کی زبان میں سنیئے:۔

> خلفاء راشدین، عشرہ مبشرہ اور دوسرے مہاجرین و انصار کے اس اجماعی فیصلے کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی حکومت کی موجودگی میں زکوٰۃ حکومت کو ادا کئے بغیر اللہ کے حکم "واٰتوا الزکوٰۃ" کی تعمیل ممکن نہیں۔ حکومت کی موجودگی

> ہیں جو اسناد دیا جا میں انفرادی طور پر زکوٰۃ جمع اور خرچ کریں گی۔ وہ مسلمانوں کی حکومت کی باغی قرار پائیں گی خواہ ان افراد یا جماعتوں یا انجمنوں کی نیتیں کتنی ہی نیک اور ان کے ارادے کتنے ہی اچھے اور ان کے پروگرام کتنے ہی عمدہ کیوں نہ ہوں۔" (صفحہ ۱۵)

مسلمانوں کی حکومت پاکستان میں زکوٰۃ کو اجتماعی یا انفرادی طور پر وصول کرنے والے زیادہ تر علمائے دین ہیں اور وہ اس رقم سے بالعموم دینی مدرسے چلاتے ہیں۔ اب جماعت اسلامی بھی زکوٰۃ سے حصہ بٹانے لگی ہے۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ ادارہ تحقیقات اسلامی کے اس فتویٰ کا اثر کہاں تک جا کر پڑتا ہے یعنی تمام علمائے دین بشمول جماعت اسلامی مسلمانوں کی حکومت پاکستان کے باغی قرار پاتے ہیں! تمام علماء نے طلوعِ اسلام کے حق میں کبھی کلمۂ خیر نہیں کہا لیکن اس کے باوجود طلوعِ اسلام نے بھی انہیں کبھی من حیث الجماعت حکومت کا باغی قرار نہیں دیا۔

زکوٰۃ کے مصارف

اب زکوٰۃ کے مصارف کی طرف آیئے۔ کتاب کا مقدمہ پڑھنے کے بعد ہم یہ توقع کر رہے تھے کہ فاضل مصنف یہ ضرور واضح فرمائیں گے کہ قرآن مجید میں جہاں زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم ہے وہاں تو جگہ جگہ زکوٰۃ کے الفاظ آتے ہیں لیکن جب اس کے مصارف کا ذکر ہوا تو پھر اس کے لئے "صدقات" کا لفظ کیوں استعمال کیا گیا لیکن اس طرف کوئی معمولی سا اشارہ کئے بغیر فاضل مصنف آگے بڑھ جاتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ "اس کی ادائیگی کا صاف اور سیدھا مطلب یہ ہوا کہ حکومت ملک سے اقتصادی اور معاشی بدحالی کا استیصال کرے اور ملک کی حفاظت کی خاطر انتہائی مضبوط و طاقتور اور زبردست دفاعی انتظام کرے۔" (صفحہ ۲۲)

اس سلسلے میں فاضل مصنف نے یہ نہیں بتایا کہ مسلمانوں کے ملک پاکستان میں کتنی زکوٰۃ وصول ہونے کا امکان ہے۔ ادارہ کے پاس جو شاندار لائبریری ہے اس کی مدد سے تھوڑی سی محنت کر کے یہ اعداد و شمار پیش کئے جا سکتے تھے۔ ہمارے ملک کے دفاع پہ چار پانچ ارب روپے سالانہ خرچ ہوتے ہیں۔ کیا زکوٰۃ سے اتنی بڑی رقم وصول ہو جائے گی کہ دفاع کے اتنے بڑے اخراجات کے بعد ملک سے اقتصادی اور معاشی بدحالی کا استیصال بھی کیا جا سکے گا۔ اس وقت تک جو عملی تجربہ ہے وہ تو ہمارے سامنے ہے کہ اس سے زیادہ سے زیادہ چند سو دینی مدرسے چل رہے ہیں اور ان کی حالت بھی خستہ ہے۔ ہمارے خیال میں اس تمام رقم کو اگر جمع کیا جائے تو بمشکل ایک جدید یونیورسٹی کے اخراجات پورے ہو سکیں گے۔ اس سلسلے میں بہت سی باتیں وضاحت طلب ہیں۔ فاضل مصنف کو بتانا چاہیئے تھا کہ انہی چیزوں کی زکوٰۃ وصول کی جائے گی جو ہمارے مولوی صاحبان فرماتے ہیں یا کچھ اور۔ دوسرے یہ بھی بتانا چاہیئے تھا کہ حکومت کی زکوٰۃ کی وصولی کے ساتھ موجودہ ٹیکس بھی برقرار رہیں گے یا انہیں ختم کر دیا جائے گا۔ کیونکہ ہمارے بعض علماء تو یہی فرماتے ہیں کہ موجودہ ٹیکس بھی برقرار رہیں گے اور بعض کہتے ہیں کہ زکوٰۃ کی موجودگی میں کوئی ٹیکس نہیں لگایا جا سکتا۔ وغیرہ وغیرہ۔

ذاتی ملکیت کے بارے فتویٰ

فرماتے ہیں: "اہل فتویٰ کا یہ فتویٰ کہ اسلام میں لامحدود ذاتی ملکیت و جائداد کی اجازت ہے انتہائی مضحکہ خیز و بے معنی ہے۔" (صفحہ ۶۹)

ہم ادارہ تحقیقات اسلامی کے فاضل رکن کو اس جرأت مندانہ اعلان پر مبارک باد پیش کرتے ہیں لیکن عدم وضاحت کی وجہ سے اس سے غلط فہمیاں پھیلنے کا امکان ہے۔ مناسب یہ تھا کہ اس سلسلہ میں متعلقہ فتاویٰ نقل کر دیئے جاتے تاکہ قارئین کو متعین طور پر معلوم ہو جاتا کہ وہ کون ہیں جو اس قسم کے مضحکہ خیز اور بے معنی فتوے صادر کرتے رہتے ہیں۔

معاشی غلامی سے نجات

زکوٰۃ کے مصارف کے سلسلے میں فاضل مصنف نے یہ فرمایا تھا کہ ملکی دفاع کو مضبوط کرنے کے بعد اسے معاشی غلامی سے نجات دلانے پر صرف کیا جائے۔ معاشی غلامی کے لئے وہ صدقات کے ایک مصرف "وفی الرقاب" (غلاموں کی گردنیں چھڑانے) کی نئی تفسیر پیش کرتے ہیں۔ ان کے الفاظ میں "ہمارے تجزیہ کے مطابق کسانوں، مزدوروں، ملازموں اور کسی حد تک کرایہ داروں میں غلامی باقی جاتی ہے۔ اور ان طبقوں میں کسان سب سے زیادہ مظلوم و مجبور ہے"۔ (صفحہ ۷۵)

جس طرف بحث کا رُخ جا رہا تھا، اس سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ شاید مصنف زکوٰۃ کی رقم کسانوں پر خرچ کرنے کی تجویز فرمائیں گے۔ لیکن اس کے لئے جو تجویز پیش کرتے ہیں، اس کا نظامِ زکوٰۃ سے بظاہر کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔ فرماتے ہیں۔

"امیر المومنین حضرت عمر فاروق اعظمؓ نے قرآن و سنت کی روشنی میں جو فیصلہ کیا تھا، اس پر عمل کرتے ہوئے ملکی دولت اور ذرائع دولت کو مسلمانوں کی اجتماعی ملکیت میں لے لیا جائے اور حکومت بطور امین اس سے عامۃ المسلمین کی بنیادی ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کا انتظام کرے۔ تاکہ ملک و قوم مسلسل ترقی کرتے رہیں"۔ (صفحہ ۹۴)

قدیم مسائل کو جدید معاشی مسائل کا لباس پہناتے پہناتے فاضل مصنف شاید یہ بھول گئے کہ حضرت عمرؓ سے بھی بہت پہلے خود حضور صلعم نے اس مسئلہ کو اس خوش اسلوبی اور سادگی سے حل کر دیا تھا کہ بڑے بڑے جدید مفکر بھی اب اسی نتیجہ پر پہنچ رہے ہیں۔ آپ نے زمین کی بٹائی کو سود قرار دے کر حرام قرار دے دیا اور جن صحابہ کرامؓ کے پاس زائد زمین تھی انہوں نے جب اس کی فروخت کے بارے میں دریافت کیا تو آپ نے فروخت کی مطلق اجازت نہ دی بلکہ یہی فرمایا کہ اسے کسی بھائی کو دے دو۔ حضور صلعم کے ان فیصلوں کی تفصیلات کئی دفعہ طلوع اسلام کے صفحات پر پیش کی جا چکی ہیں۔ مختصر یہ کہ آپ نے زمین سے آمدنی کا حقدار صرف اسے قرار دیا جو اس میں ہل چلائے اور یہی وہ فکر ہے جسے آج بڑے بڑے مفکر (LAND FOR THE TILLER) کے نظریہ کی صورت میں پیش کر رہے ہیں۔

اسی ضمن میں اہلِ دیہات کے حالات بیان کرتے کرتے فاضل مصنف کچھ ایسی باتیں فرما گئے ہیں جن سے مشکل اتفاق کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً ان کا یہ کہنا کہ "انسانوں کی یہ کثیر آبادی علم و فضل اور عقل و شعور سے جس طرح صدیوں سے پہلے عاری تھی اسی طرح آج بھی عاری ہے"۔ (صفحہ ۸۷) حقیقت کی عکاسی نہیں کرتا۔ ملک کی نوّے فیصد آبادی (صفحہ ۷۷) کو اس طرح عقل و شعور سے عاری قرار دینا کہاں کا انصاف ہے؟

اس چھوٹی سی کتاب میں نظامِ زکوٰۃ کے علاوہ اسلامی تحقیق کے اور بھی نادر نمونے ہیں جن سب کا نقل کرنا تو ہمارے لئے ممکن نہیں۔ نمونے کے لئے صرف ایک پیش کیا جاتا ہے۔

اسلامی فقہ کا ایک اور ماخذ - رومی قانون

مصنف نے مسئلہ تعلیم پر بھی چوڑی بحث فرمائی ہے۔ اس بحث کے دوران اسلامی فقہ کے متعلق فرماتے ہیں۔

"صدرِ اسلام کے فقہائے رومی قانون کی روایات میں سے وہ اجزاء جو اسلامی مزاج کے موافق تھے اپنائے۔ حتیٰ کہ وہ اسلامی فقہ کا حصہ بن گئے۔ ان بنیادی اصولوں کے اخذ کا نتیجہ تھا کہ رومی قانون کی عظمت جاتی رہی اور اس کی جگہ اسلامی قانون کی بالادستی قائم ہو گئی"۔ (صفحہ ۱۲۶)

یعنی جس چیز کو ہم مستشرقین کا تعصب قرار دیتے رہے اب وہ ادارہ تحقیقاتِ اسلامی کی تحقیق کی صورت میں سامنے

آیا یہ کہ اسلامی فقہ نے بنیادی اصول رومی قانون سے لئے ہیں!

قرآن مجید میں ایک آیت ایسی ہے جس میں زکوٰۃ کا صحیح تصور سامنے لایا گیا ہے۔ ہم متلاشی رہے کہ فاضل مصنف اس آیت کو بھی کہیں پیش کرتے ہیں لیکن ہماری یہ تلاش ناکام رہی۔ اس آیت میں کہا گیا ہے کہ اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ.... (۲۲/۴۱)۔ "یہ وہ لوگ ہیں کہ جب ملک میں ان کی حکومت قائم ہوگی تو یہ نظامِ صلوٰۃ قائم کریں گے اور زکوٰۃ دیں گے"؟ یہاں اسلامی حکومت کا فریضہ "ایتائے زکوٰۃ" (زکوٰۃ دینا) قرار دیا گیا ہے۔ اس کے برعکس فاضل مصنف (روشِ عامہ کے اتباع میں) حکومت کا فریضہ زکوٰۃ لینا (مالِ زکوٰۃ وصول کرنا) بتلاتے ہیں۔ کیا یہ ایسا بنیادی نکتہ نہیں تھا جس کی وضاحت کی جاتی؟ — کتاب میں کئی ایک مقامات اور بھی ہیں جو قرآنی تعلیم سے ٹکراتے ہیں لیکن ان کی صراحت کا یہ مقام نہیں۔

حرفِ آخر

زمانہ قدیم کے علماء کی ایک مجلس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہاں ایک مولوی صاحب ہمیشہ خاموش بیٹھے رہتے تھے۔ ایک دن سب علماء نے اس سے درخواست کی کہ آج آپ بھی کچھ فرمائیے۔ اس پر اس نے دریافت کیا کہ روزہ کس وقت افطار کرنا چاہیئے؟ سب نے جواب دیا کہ سورج غروب ہونے پر۔ اس پر وہ خاموش مولوی صاحب بولے کہ اگر سورج آدھی رات تک غروب ہی نہ ہو تو پھر کیا کیا جائے؟ اس پر تمام علماء نے بیک زبان ہو کر فرمایا کہ آپ خاموش ہی اچھے تھے! ادارہ تحقیقاتِ اسلامی نے "جدید معاشی مسائل" کے بارے میں ایسی نادر تحقیق پیش کرنی تھی تو پھر اس کا خاموش رہنا ہی اچھا تھا۔ (محمد شاہد)

—— (۰) ——

۲۔ مراقبات

مصنف: جناب صارم۔ ناشر: ادارۂ علمیہ، ۳۵ دھنی رام روڈ، نئی انارکلی، لاہور۔ قیمت پانچ روپے۔

ہم نے اس سے پہلے عبدالصمد صارم صاحب کی دو ایک کتابیں دیکھیں (بالخصوص عربی کتب کے تراجم) ان میں ہمیں کوئی خاص بات نظر نہ آئی بجز اس کے کہ ان کے اسلوب بیان میں مخصوص ملّایانہ یبوست تھی۔ اب زیرِ نظر کتاب دیکھ کر ہمیں افسوس (بلکہ صدمہ) ہوا کہ ان کی اس یبوست نے انہیں رفتہ رفتہ اس مقام تک پہنچا دیا جہاں انسان محسوس کرنے لگتا ہے کہ وہ "روحانیت" کے منازل طے کر رہا ہے لیکن جو علمِ طب کی رُو سے دماغی خرابی ہوتی ہے۔ معلوم نہیں وہ کون تھا جس نے پہلے پہل مسلمانوں میں اس (سر تا سر غیر اسلامی) تصور کو رائج کیا کہ (وحیِ خداوندی کے بعد جس کا سلسلہ حضور نبی اکرمؐ کی ذاتِ اقدس پر ختم ہو گیا) انسانی عقل و بصیرت، اور فکر و تدبر کے علاوہ ایک اور ذریعۂ علم بھی ہے جس کی رُو سے انسان کو وحی کی طرح، براہِ راست خدا سے علم حاصل ہوتا ہے۔ یہ تصور ختمِ نبوت کا نقیض اور تکمیلِ وحی کے خلاف بہت بڑی سازش تھا۔ اس تیرہ سو سال میں امت پر جو تباہیاں آئیں ان کے اسباب میں ایک بڑا سبب یہ تصور بھی تھا۔ اسی کا تازہ شکار صارم صاحب نظر آتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

بعض اوقات میرے دماغ پر حقائق کی اس طرح بارش ہوتی ہے کہ میں پریشان ہو جاتا ہوں۔ اکثر باتوں کو بھول جاتا ہوں، کچھ قلمبند کر لیتا ہوں۔ کچھ ایسے ہیں جن کے ضبط کے لئے قلم اٹھاتا ہوں تو دنیا کے کسی لعنت کیے

مجھے مافی الضمیر کی ادائیگی کے لئے الفاظ نہیں ملتے اور کچھ حقائق ایسے ہیں کہ میری سمجھ سے بالاتر ہوتے ہیں۔

یہ حقائق "کس قسم کے ہوتے ہیں" ان کے دو ایک نمونے ملاحظہ فرمایئے۔ "عالم لاہوت" کے تحت لکھتے ہیں۔

> میں نے خدائے تعالیٰ کو چودھویں کے چاند کی شکل میں بارہا دیکھا ہے۔

"عالم ملکوت" کے زیر عنوان ارشاد ہے۔

> مجھے لاتعداد فرشتے آسمان سے اترتے اور چڑھتے دکھائی دیتے ہیں۔ ایک دفعہ میں نے فرشتوں کو ایسے پرندوں کی شکل میں دیکھا کہ قلم ان کے حسن کے بیان سے قاصر ہے۔

یہ سوال کہ روح کسے کہتے ہیں' مذہب اور فلسفہ کی درسگاہوں میں صدیوں سے زیر بحث چلا آرہا ہے۔ دیکھئے کہ صائم صاحب کی تحقیق (بلکہ مکاشفہ) اس باب میں کیا کہتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

> مادہ لطیف ہوتے ہوتے اور ہضم در ہضم سے گذرتے گذرتے منی بن کر روح بن جاتا ہے۔

"عالم روحانیت" کے ضمن میں لکھتے ہیں۔

> مجھے کبھی گھنٹے کی آواز سنائی دیتی ہے اور کبھی ناقوس بجنے کی۔

اس کے بعد فرماتے ہیں۔

> بعض اوقات میں اپنے اندر ایسی روحانی طاقتیں پاتا ہوں جیسی ہندو دیوتاؤں میں بیان کی جاتی ہیں۔

ان طاقتوں کے حاصل کرنے کا طریقہ کیا ہے' اسے بھی دیکھ لیجئے۔ لکھتے ہیں۔

> ایک پاؤں کھڑا کر کے اور دونوں ہاتھ اسی گھٹنے پر رکھ کر ٹھوڑی کو ان ہاتھوں پر رکھ کر بیٹھنے سے صبر کی عادت پیدا ہوتی ہے جس طرح گوتم بدھ بیٹھتے تھے۔ اس طرح کی بیٹھک سے بہادری جس طرح گاندھی جی بیٹھتے تھے اس طرح بیٹھنے سے مکاری اور جس طرح تشہد میں بیٹھتے ہیں اس طرح بیٹھنے سے سچائی پیدا ہوتی ہے شاید غار حرا میں حضورؐ اسی طرح بیٹھتے تھے۔

یعنی' ان صاحب کے نزدیک حضور نبی اکرمؐ نے بھی اسی قسم کی ریاضتوں اور مراقبوں سے مقام نبوت حاصل کیا تھا۔ معاذ اللہ۔ ثم معاذ اللہ۔ چہ بے خبر ز مقامِ محمدؐ عربی است!

ان ریاضتوں کے متعلق ارشاد ہے۔

> ریاضتِ روحانی، بالکل ریاضتِ جسمانی کی طرح ہے۔ خواہ کافر کرے یا غیر کافر۔ اپنی کوشش کے مطابق پھل پائے گا۔

چلئے! کفر و اسلام کی تمیز و تفریق کا "ٹنٹا" بھی ختم ہوا۔

یہ صائم صاحب کے مراقبات کے ماحصل کی ابتدا ہے۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔ ہمیں تو اتنا ہی معلوم ہے کہ اس قسم کے امراض کی آخری شکل وہ دیوانگی ہوتی ہے جسے "روحانیت" کی اصطلاح میں "مجذوبیت" کہہ کر پکارا جاتا ہے اور جس کا کوئی علاج نہیں ہوتا۔

(۰)

۳۔ تحریکِ آزادی

مصنف: صلاح الدین ناسک۔ ناشر: عزیز بک ڈپو چوک اردو بازار لاہور۔ کتابت طباعت۔ دیدہ زیب،

کاغذ سفید۔ متوسط سائز۔ ضخامت ۵۰۲ صفحات۔ قیمت مجلد (۱۷/۵۰) روپے۔

ہم یہ شکایت مسلسل کرتے چلے آ رہے ہیں کہ یہ قوم کی بدقسمتی ہے کہ آج تک نہ تو تحریکِ پاکستان کے متعلق کوئی مستند کتاب شائع ہوئی ہے اور نہ ہی قائداعظم کے سوانح حیات کے متعلق کوئی قابلِ اعتماد تصنیف۔ اب جو مملکتِ پاکستان کو یہ زلزلہ انگیز دھچکا لگا ہے (جس کے نتیجہ میں آدھی مملکت ہاتھ سے نکل گئی ہے) تو بعض گوشوں میں اس کمی کے پورا کرنے کا احساس بیدار ہوا ہے۔ زیرِ تبصرہ کتاب اسی شدتِ احساس کا نتیجہ ہے۔ کتاب کے مندرجات کے متعلق تو بعد میں کہا جائے گا، اس کے مطالعہ سے جو مجموعی تاثر دل میں پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ مصنف کو اسلام سے والہانہ محبت اور پاکستان سے مجنونانہ شیفتگی ہے اور یہ وہ بنیادی خصوصیات ہیں جو تحریکِ پاکستان کو اس کے صحیح پس منظر میں پیش کرنے کے لئے لاینفک ہیں۔ اس نہج سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے جو ہمارے سامنے آئی ہے۔ اسلام سے اسی قلبی وابستگی کا نتیجہ ہے کہ مصنف نے آغازِ سخن ظہورِ اسلام سے کیا ہے۔ اس کے بعد ہمارے سامنے ہندوستان میں مسلمانوں کے دورِ عروج و زوال حیرت و عبرت آمیز داستان آتی ہے۔ پھر مسلمانوں کے خلاف انگریز اور ہندو کی سازشیں اور مسلمانوں کے دل میں نشاۃِ ثانیہ کے جذبہ کی بیداری۔ یہ ہے اس تحریکِ پاکستان کا قدم اول جو مختلف مراحل طے کرتی اور مساعد و نامساعد منازل میں سے گزرتی، تقسیمِ ہند اور قیامِ پاکستان پر جا کر رکتی ہے۔ چونکہ یہ داستان بڑی طویل ہے اور قریب چھ صد صفحات کے باوجود گنجائش کم، اس لئے تفاصیل کے سلسلہ میں قدم قدم پر مصنف کا قلم تنگیٔ داماں کا شکوہ سنج نظر آتا ہے اور اسے مجبوراً اختصار سے کام لینا پڑتا ہے۔ بایں ہمہ اس میں اس سلسلہ کی قریب قریب تمام کڑیاں سامنے آگئی ہیں۔ کتاب کا آخری باب ہے — آخر پاکستان ہی کیوں؟ — یہاں پہنچ کر مصنف کے پاؤں میں لغزش آگئی ہے — اور یہ غالباً اس زہر کا غیر شعوری اثر ہے جسے ایک سازش کے ماتحت ایک عرصہ سے فضائے پاکستان میں پھیلایا جا رہا ہے۔ وہ مطالبۂ پاکستان کے جذبۂ محرکہ کے سلسلہ میں لکھتے ہیں۔

> انگریز کی اشیرباد سے ہندو نے مسلمانوں کے ساتھ غیر انسانی سلوک کا آغاز کر دیا۔ اسے سفید فام آقاؤں کی وفاداری کا زعم تھا اور انگریز بنیئے کی پیٹھ اس لئے ٹھونکتا رہا کہ وہ مسلمانوں کی قوت اور ان کے عقیدہ کی پختگی سے ہمیشہ خائف رہا تھا۔ انگریز نے مسلمانوں کے خلاف جو کچھ علی الاعلان نہ کرنا چاہا، وہ ہندو کے ذریعے کرایا۔ اس تمام مدت میں مسلمانوں کی معاشی، مذہبی، ثقافتی اور معاشرتی حیثیت کو بری طرح کچلنے کی کوشش کی گئی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان اپنے لئے ایک علیحدہ اور ایسی مملکت کا مطالبہ کرنے پر مجبور ہو گیا جہاں اسے یہ تمام آزادیاں حاصل ہوں۔ اس اعتبار سے علیحدہ مملکت کا مطالبہ نہ تو خالص جذباتی اور نہ ہی خالص مذہبی مطالبہ تھا بلکہ اس مطالبہ کے شانہ بشانہ ایک تاریخی اور تہذیبی منطق بھی موجود تھی۔

یہ ہے وہ غلط فہمی جو آجکل عام طور پر پھیلائی جا رہی ہے کہ مسلمانوں نے ہندو کی تنگ نظری اور بدسلوکی سے تنگ آکر، مجبوراً علیحدگی کا مطالبہ کیا تھا۔ یہ سراسر غلط ہے۔ مطالبۂ پاکستان کا جذبۂ محرکہ خالص دینی تھا۔ اور وہ اس طرح کہ مسلمان اپنی آزاد مملکت کے بغیر اسلامی زندگی بسر کر ہی نہیں سکتا۔ ہمارے مطالبۂ پاکستان کی یہ مثبت بنیاد تھی اور ہندو خواہ کتنا ہی کشادہ ظرف کیوں نہ ہوتا، مملکت ہندوستان میں ہمارا یہ دینی تقاضا پورا ہو نہیں سکتا تھا۔

مصنف کو یہاں خفیف سی لغزش ہوئی لیکن چونکہ اس کا قلب و دماغ اسلامی سانچے میں ڈھلا ہوا ہے اسلئے

وہ اگلے ہی قدم پر سنبھل گیا۔ اور اس نے اس امر کی وضاحت کر دی کہ

> پاکستان مسلم قومیت کے بنیادی اصول پر قائم کیا گیا جہاں مسلمانوں کو ہر قسم کا تحفظ اور اپنی ثقافت کو پروان چڑھانے کا حق اور آزادی حاصل ہو۔ اس اعتبار سے پاکستان کی تشکیل ایک اسلامی ریاست پر کی گئی۔

اور کتاب کا اختتام ان الفاظ پر کیا گیا — جو ان لوگوں پر جو پاکستان میں رہنے پر مجبور ہیں لیکن سینوں میں ابھی تک متحدہ قومیت اور سیکولر حکومت کے بت چھپائے بیٹھے ہیں، معلوم کس قدر گراں گذرے ہونگے۔ وہ الفاظ یہ ہیں۔

> مذہب ہماری سیاست کا جزو لاینفک ہے۔ یہ کوئی عیسائی سیاست نہیں جہاں روحانی اور مذہبی معاملات اور سیاسی اور ملکی معاملات دو مختلف ہاتھوں میں منقسم ہیں۔ یہ اسلامی مملکت ہے جہاں ہر مسلمان کے ہاتھ میں قرآن بھی ہے اور تلوار بھی۔ پاکستان میں ہندو یا عیسائی فلسفہ اور طرز حکومت کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ اس لئے کہ پاکستان کی بنیاد اسلامی نظریہ پر ہے اور اسلام سیاست اور مذہب کو کسی قیمت پر دو الگ الگ چیزیں تسلیم نہیں کرتا۔ ورنہ اس کے نظام کی بنیاد ہی ختم ہو جاتی۔

ہم مصنف کی اس حق گوئی و بیباکی پر اسے دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

کتاب کا مقدمہ محترمہ سلمٰی خلیل نے لکھا ہے۔ محترمہ کو مبداءِ فیض کی کرم گستری سے جو قلبِ سلیم، روشن دماغ، اور حسین قلم عطا ہوا ہے اس کی مثال کم ملے گی۔ ان کے مقدمہ نے اس "سرچ لائٹ" کا کام دیا ہے جس کی روشنی میں، کتاب کا ماحصل نکھر اور ابھر کر سامنے آجاتا ہے۔ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ؕ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ ؕ

(o)

۴۔ افکارِ سیاسی (مشرق و مغرب)

یہ بھی نامک صاحب ہی کی کتاب ہے اور زمانی نسبت سے اسے "تحریکِ آزادی" پر اولیت حاصل ہے۔ کیونکہ وہ کتاب اپریل ۱۹۷۲ء میں شائع ہوئی تھی اور یہ جنوری ۱۹۷۲ء میں۔ اس کتاب کو انہوں نے مرتب تو کیا ہے بی۔ اے آنرز اور ایم۔ اے کے طلباء کی ضروریات کو پیشِ نظر رکھ کر لیکن اس میں معلومات اس قدر فراوانی اور حسنِ ترتیب سے یکجا کر دی گئی ہیں کہ اس کا استفادہ عام ہو گیا ہے۔ اس میں انہوں نے مغرب اور مشرق کے نامور مفکرین کے خیالات (بالخصوص وہ جن کا تعلق سیاسیات اور اخلاقیات سے ہے) نہایت صاف انداز اور واضح زبان میں پیش کر دیئے ہیں۔ مفکرینِ مغرب کی ابتداء یونان سے کی گئی ہے اور ماؤزے تنگ پر ان کا خاتمہ ہوا ہے۔ اسلامی افکار میں فارابی، الماوردی۔ طوسی۔ کیکاؤس۔ غزالی۔ ابنِ طقطقی۔ ابنِ تیمیہ۔ ابنِ خلدون۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ۔ جمال الدین افغانی۔ اقبال کا انتخاب کیا گیا ہے۔ جہاں تک کیکاؤس کا تعلق ہے ہمارا خیال ہے کہ اردو زبان میں شاید پہلی مرتبہ اس کے افکار کو سامنے لایا گیا ہے۔ اس کے خیالات ہیں بھی عجیب و غریب۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ

> اگر لوگ برا نہ منائیں تو ارتکابِ گناہ میں کوئی ہرج نہیں۔

مشرق و مغرب کے مفکرین کے خیالات کی جمع و تدوین میں مصنف نے بڑی محنت و کاوش سے کام لیا ہے۔ اور

(نظر آتا ہے کہ انہوں نے) سینکڑوں کتابوں کے مطالعہ کے بعد اس مفید ذخیرہ کو یکجا کیا ہے۔ بعض مقامات البتہ تشنۂ تحقیق رہ گئے ہیں۔ مثلاً علامہ اقبالؒ سے متعلق باب مزید تعمق اور وسعت کا متقاضی تھا۔ بایں ہمہ کتاب بڑی معلومات افزا ہے اور مصنف اور ناشر کی حوصلہ افزائی کی مستحق۔

اس کتاب کا مقدمہ بھی محترمہ سلمیٰ خلیل نے لکھا ہے' اور جس جذب وکیف اور سوز وگداز سے لکھا ہے' وہ انہی کا حق ہے۔ آغازِ سخن یوں ہوتا ہے کہ

> عمرانی تاریخ کا وہ بڑا اندوہناک موڑ تھا جب ۶۲۸ء میں قیصر روم (ہرقل) نے پیغمبر آخر الزمانؐ کا مراسلہ (دعوت نامہ اسلام) آنکھوں سے لگایا، سر پر رکھا اور آپؐ کے سفیر کو سلام و نیاز کیساتھ واپس کر دیا۔

اس کے بعد اس امر کی وضاحت کی گئی ہے کہ ہرقل نے کس طرح ابوسفیانؓ سے حضور نبی اکرمؐ کے متعلق تفصیلات معلوم کیں اور اس کے بعد کہا کہ

> اگر یہ باتیں سچ ہیں تو خدا کی قسم میرے پاؤں کی مٹی تک پر وہ قابض ہو جائے گا۔ کاش میں اس کے پاس جا سکتا اور اس کے پاؤں دھوتا۔

اس پر محترمہ نے نہایت حسرت ویاس (بلکہ درد وکرب) کے ساتھ کہا ہے کہ یورپ جو ڈیڑھ ہزار سال سے جہنم کی آگ میں بُری طرح جلس رہا ہے' اس کی بنیادی وجہ ہرقل کی وہ بدنصیبی ہے جس سے وہ اس ذاتِ اقدس واعظمؐ کے پاؤں دھونے کی سعادت سے محروم رہا۔ اگر اس کی قسمت یاوری کرتی اور وہ اس آستانۂ پاک پر حاضر ہو کر حضورؐ کی پاشوئی کی سعادت حاصل کر لیتا، تو نہ صرف یورپ' بلکہ دنیا کا آج کچھ اور ہی نقشہ ہوتا۔ ازاں بعد محترمہ نے جہنم کے ان تمام شعلوں کو ایک ایک کر کے گنایا ہے جن کی لپیٹ میں یورپ اس ڈیڑھ ہزار سال کے عرصہ میں ملوث رہا ہے۔ اور آخر میں لکھا ہے کہ یورپ (بلکہ دنیا) کو' اپنے اس قدر ناکام تجارب کے بعد'

> وہ پاؤں دھونے ہی پڑیں گے جن کے دھونے کی حسرت ۶۲۸ء میں رہ گئی تھی۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

کیا آپ نے بارگاہِ رسالتمآبؐ میں خراجِ عقیدت و اعترافِ عظمت کا اس سے زیادہ پاکیزہ، اچھوتا اور حسین انداز کہیں اور بھی دیکھا ہے؟ ہم اپنے متعلق اتنا ہی کہیں گے کہ اس فقرہ کے پڑھنے پر ہماری آنکھیں بے اختیار اشکبار ہو گئیں۔ جس قوم میں اس قسم کی بیٹیاں موجود ہوں' اس کے لئے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔

بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی پوشیدہ ہیں!

کتاب صوری حیثیت سے بھی دیدہ زیب اور دلکش ہے۔ ضخامت قریب چھ سو صفحات۔ قیمت مجلد (۱۷/۵۰) روپے۔
ملنے کا پتہ:۔ عزیز بک ڈپو۔ اردو بازار۔ لاہور

(۱)

۵۔ مدارسِ عربیہ کا جائزہ

حافظ نذر احمد صاحب (پرنسپل شبلی کالج۔ لاہور) مدارسِ عربیہ میں خاص دلچسپی رکھتے ہیں لیکن ان کی دلچسپی ان لوگوں جیسی نہیں جو ایک مدرسہ کھول لیتے ہیں۔ اس کے نام پر لوگوں سے چندے وصول کرتے ہیں اور مل بانٹ کر

کھا لیتے ہیں۔ ان کی دلچسپی کی نوعیت یہ ہے کہ وہ ان مدارس کے احوال و کوائف جمع کرتے ہیں۔ ان کے نظم و نسق کا جائزہ لیتے ہیں' نصابِ تعلیم کو کھنگالتے ہیں' اور ان معلومات کو مدون کر کے قوم کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے ۱۹۶۰ء میں "جائزہ مدارس عربیہ مغربی پاکستان" کے نام سے ایک ضخیم رپورٹ شائع کی تھی۔ اب انہوں نے اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا ہے جو زیرِ تبصرہ ہے۔ "رپورٹ" سے مراد کوئی کتابچہ نہیں' یہ متوسط سائز کے (۲۰۷) صفحات پر پھیلی ہوئی کتاب ہے جو سفید کاغذ پر چھپی ہے اور مجلد ہے۔ نیز اس میں متعدد چارٹ اور تصاویر ہیں۔ قیمت اس کی اٹھارہ روپے ہے اور مسلم اکادمی محمد نگر، علامہ اقبال روڈ لاہور سے مل سکتی ہے۔

اس جائزہ میں شائع شدہ اعداد و شمار دلچسپ بھی ہیں اور معلومات افزا بھی۔ ۱۹۶۰ء کی رپورٹ میں (۲۹۲) مدارس کے کوائف اور (۴۷۱) کی فہرست شائع ہوئی تھی۔ اب (۵۶۳) مدرسوں کے کوائف اور (۸۹۳) کی فہرست پیش کی گئی ہے۔ گویا اس جائزہ کے مطابق اس وقت مغربی پاکستان میں (۸۹۳) عربی مدارس اور دارالعلوم جاری ہیں۔ ——

(۲) تقسیم ہند سے پہلے مغربی پاکستان میں (۱۳۷) مدارس تھے۔ دس مدرسے بھارت سے آ گئے۔ اس طرح تشکیل پاکستان کے بعد یہاں کل (۱۴۷) مدرسے تھے۔ (بھارت سے مدرسے کس طرح آ گئے تھے' یہ بات سمجھ میں نہیں آئی) اور اب یہاں (۸۹۳) مدارس ہیں۔ گویا اس پچیس سال کے عرصہ میں یہاں قریب ساڑھے سات سو مدرسے نئے کھلے۔

(۳) ان مدارس میں (۳۱۸۶) اساتذہ ہیں اور (۴۵٬۲۲۸) طلباء۔

(۴) ان مدارس کی مجموعی آمدنی (۷۸٬۸۳٬۰۰۰) اور خرچ (۸۱٬۵۷٬۴۰۶) روپے (غالباً سالانہ) ہے۔ گویا قوم کا قریب ساڑھے اکیاسی لاکھ روپیہ (سالانہ) ان مدرسوں کی نذر ہو جاتا ہے۔ یہ رواں خرچ کا اندازہ ہے۔ ان کی عمارات وغیرہ پر جو خرچ آچکا ہے یا آتا ہے' وہ اس کے علاوہ ہے۔

(۵) اوپر بتایا جا چکا ہے کہ قریب نو سو مدرسوں میں قریب (۵۰٬۰۰۰) طلباء تعلیم پاتے ہیں۔ گویا ہر مدرسہ میں اوسطاً (۵۰) طلباء زیرِ تعلیم رہتے ہیں۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ ہر سال ہر مدرسہ میں دس نئے طالب علم داخل ہوتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہر مدرسہ سے ہر سال دس طلباء تعلیم سے فارغ ہو کر باہر آ جاتے ہیں یعنی مغربی پاکستان میں ہر سال تقریباً نو ہزار (۹٬۰۰۰) ایسے مولوی صاحبان کا اضافہ ہو جاتا ہے جو اپنی ایک وقت کی روٹی کمانے کے بھی اہل نہیں ہوتے اور ان کی معاش کا ذریعہ یا عربی مدارس کی معلمی ہوتا ہے یا مساجد کی امامت و خطابت۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ جب یہ نو ہزار طالب علم (مولوی صاحبان) باہر آتے ہیں تو ملک کے عربی مدارس میں اساتذہ بھی موجود ہوتے ہیں اور مساجد میں امام اور خطیب بھی۔ ان (نو ہزار) کے لئے اس کے سوا چارہ ہی نہیں ہوتا کہ وہ نئے مدرسے کھولیں اور نئی مساجد تعمیر کرائیں۔ مدرسے کھولنا آسان نہیں ہوتا' لہٰذا ان کا زور مسجدیں تعمیر کرانے پر صرف ہوتا ہے۔ اس سے یہ حقیقت سامنے آ جاتی ہے کہ یہ جو آئے دن ہر خالی جگہ پر ایک نئی مسجد ابھرتی دکھائی دیتی ہے اس کا تقاضا کیا ہوتا ہے؟ اس کا تقاضا نمازیوں کی کثرت اور مساجد کی قلت نہیں ہوتا۔ اس کا تقاضا ان نو ہزار فارغ التحصیل طلباء کے لئے ذریعہ معاش پیدا کرنا ہوتا ہے۔ یہ وجہ ہے کہ نمازی دن بدن کم ہوتے جا رہے ہیں اور مسجدیں زیادہ۔

پھر اسے بھی ذہن میں رکھئے کہ مسجد کی تعمیر کے معنی اس کی عمارت کا خرچ ہی نہیں۔ یہ خرچ تو ایک دفعہ ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد اس کی مرمت اور حفاظت و نگرانی کا خرچ۔ امامت و خطابت کا خرچ۔ روشنی اور پانی کا خرچ۔ صفوں' دریوں'

اور قائلوں کا خروج۔ اس گوشے کی طرف کبھی کسی ماہرِ معاشیات کی نگاہ ہی نہیں اٹھی‘ ورنہ نظر آجاتا کہ ملک کی دفاع پر شاید اتنا خرچ نہ آتا ہو جتنا خرچ پہلے "علماء سازی" اور پھر "علماء پروری" پر آ رہا ہے۔

(۷) اور جنہیں "علماء" کہا جاتا ہے ان کے پاس علم کس قسم کا ہوتا ہے‘ اس کا اندازہ اس نصاب سے لگ سکتا ہے جس کی تفصیل اس جائزہ میں سامنے لائی گئی ہے۔ درسِ نظامی کے نو سال پر مشتمل نصاب میں بیس "علوم و فنون" سے متعلق قریب اسّی کتابیں پڑھائی دیا پڑھائی جاتی ہیں جن سے طالب علم (لسان العصر اکبر الٰہ آبادی کے الفاظ میں) "چاہِ زمزم کے مینڈک" سے زیادہ کچھ نہیں بنتا۔

بہرحال جہاں تک اس جائزہ کا تعلق ہے عربی مدارس کے منتظمین کو حافظ نذر احمد صاحب کا شکر گزار ہونا چاہیئے کہ انہوں نے ان کے مدارس کا اس انداز سے تعارف کرا دیا ہے جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اور قوم کو حافظ صاحب کا ممنون ہونا چاہیئے کہ انہوں نے ان مدارس کے متعلق ایسی معلومات بہم پہنچا دی ہیں جن کی روشنی میں ان کے صحیح خط و خال سامنے آجاتے ہیں۔

طلوعِ اسلام کالج فنڈ

بسلسلہ فہرست مطبوعہ طلوعِ اسلام بابت ستمبر ۱۹۷۲ء حسبِ ذیل عطیات بشکریہ موصول ہوئے۔

فہرست "ب"

۱۔ محترمہ بیگم عباسی صاحبہ۔ راولپنڈی	۱۰۰/-	۶۔ محترم عبید اللہ جان صاحب۔ ملکہ ڈھیر (پشاور)	۱۰۰/-
۲۔ محترم ظہور الدین بھٹی صاحب۔ لاہور	۱۰/-	۷۔ " ملک حنیف وجدانی صاحب تحصیل مری	۵/-
۳۔ " بشیر احمد صاحب۔ ملکوال	۳۰/-	۸۔ " محمد ارشاد صاحب " "	۵/-
۴۔ " نور الاسلام صاحب۔ لاہور	۱۰۰/-	۹۔ " ڈاکٹر محمد اسمٰعیل صاحب۔ چنیوٹ	۱۰۰/-
۵۔ " ڈاکٹر محمد حیات خان صاحب۔ مظفر گڑھ	۵۰۰/-	۱۰۔ محترمہ مسز آسیہ حمید۔ لندن	۵۰۰/-

(نوٹ) (I) طلوعِ اسلام بابت ستمبر ۱۹۷۲ء کے صفحہ ۱۲ (نمبر شمار ۷) کے تحت کالج فنڈ کے لئے مبلغ ۵۰۰/- روپے کے عطیہ کا اعلان میسرز ایم شاہ محمد اینڈ سنز۔ ملتان کے نام سے درج ہوا ہے۔ وہ دراصل بزمِ طلوعِ اسلام ملتان کی طرف سے ہے۔

(II) قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی (رجسٹرڈ) ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور کو دیئے گئے عطیات ایس۔ آر۔ او نمبر ۲۵/(K)/۷۲ مورخہ ۳۰ مطبوعہ گزٹ آف پاکستان پارٹ II مورخہ ۵ ۱۳ کی رُو سے انکم ٹیکس ایکٹ ۱۹۲۲ء سیکشن ۵/۱۵ کے تحت انکم ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دیئے گئے۔

(سیکرٹری) قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی (رجسٹرڈ) لاہور

مرتبہ: محمد اسلام نمائندہ طلوعِ اسلام کراچی

طلوعِ اسلام نے کیا کچھ نہیں کہا

(گذشتہ پچیس سال کے سفرِ حیات پر نگہِ بازگشت)

وحی اور عقل دونوں کے پیشِ نظر انسانی مسائل کا حل ہوتا ہے، وحی کے سامنے چونکہ حقائق بے نقاب ہوتے ہیں اور اس کی بنیاد علمِ خداوندی پر ہوتی ہے اس لئے وہ ان مسائل کا یقینی حل پیش کرتی ہے جس میں ظن و قیاس کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس عقل قیاس پر چلتی ہے اور اس کا طریق تجرباتی ہوتا ہے۔ وہ ایک حل پیش کرتی ہے پھر اس پر تجربہ کرتی ہے اور قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتی ہے۔ ان ٹھوکروں سے اس کا خون بہتا ہے، ہڈیاں ٹوٹتی ہیں۔ اس کے بعد پتہ چلتا ہے کہ قدم غلط سمت کو اٹھا تھا۔ وہ اس ناکام تجربہ کو چھوڑ کر پھر دوسری طرف قدم اٹھاتی ہے۔ اس طرح ٹھوکریں مارتی اور ٹھوکریں کھاتی جب آخر الامر کسی یقینی نتیجہ پر پہنچتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی منزل ہے جس کا تعین وحی نے پہلے ہی کر دیا تھا۔

وحی کو انسانی مسائل کے جو حل تجویز کرنے تھے انہیں آخری مرتبہ قرآن میں محفوظ کر دیا گیا اور اس طرح وحی کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا گیا۔ اب جو لوگ مسائل کا حل وحی کی رو سے کرنا چاہتے ہیں انہیں قرآن پر غور و فکر کرنا ہوگا۔ جو قوم ایسا کرے گی وہ ان تباہیوں اور بربادیوں سے بچ جائے گی جو عقل کے تجرباتی طریق کا لازمی نتیجہ ہے طلوعِ اسلام اسی روش کا داعی ہے۔ وہ انسانی مسائل کا حل قرآن کی روشنی میں تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے اور دوسروں کو بھی اسی کی طرف دعوت دیتا ہے۔

تحریکِ پاکستان کی تائید اور حمایت میں طلوعِ اسلام کی داستانِ جہاد سینکڑوں نہیں ہزاروں صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ یہ ہزارہا صفحات ہماری زندگی کی مقدس ترین آرزوؤں کے ترجمان تھے اور ان تحریروں کا ایک ایک لفظ خونِ جگر سے لکھا گیا۔ طلوعِ اسلام علیٰ وجہ البصیرت اس حقیقت پر یقین رکھتا ہے کہ جہاں تک احیائے دین کی آرزوؤں کا تعلق ہے، وہ ایک جیتے جاگتے اور محسوس و مشہود نظامِ زندگی کے پیکروں ہی میں تکمیل پا سکتی ہیں اور ایسے نظامِ حیات معاشرہ یا مملکت کے قیام کے لئے ایک خطۂ زمین کا وجود ناگزیر ہے۔

طلوعِ اسلام کے نزدیک صرف خطۂ زمین کے حصول ہی سے تحریکِ پاکستان کا مقصد پورا نہیں ہو جاتا تھا۔ اسکے سامنے اگلی منزل اس سے بھی زیادہ اہم تھی۔ اس کے نزدیک اگر اس سرزمین پر نظامِ خداوندی کا آفتاب جلوہ بار نہیں

ہوتا۔ اگر یہ مملکت اپنے نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگا نہیں اٹھتی اور انسانوں کے خود ساختہ قوانین کے بجائے یہاں خدائی قوانین کارفرمائی کا سرچشمہ قرار نہیں پاتے تو جس مقصد کے لئے اس خطۂ زمین کو حاصل کیا گیا تھا وہ مقصد پورا نہیں ہو سکتا۔

یہی وجہ تھی کہ حصولِ پاکستان کے بعد جب نئی منزل طلوعِ اسلام کے سامنے آئی تو اس نے اس منزل پر اربابِ اقتدار کے اٹھتے ہوئے ہر قدم کا بنظرِ غائر جائزہ لیا اور جہاں کہیں اسے یہ نظر آیا کہ تحریکِ پاکستان کے ارفع و اعلیٰ مقاصد کے داغدار ہونے کا خطرہ لاحق ہے اس نے پوری قوت سے اس کا محاسبہ کیا۔ یہ محاسبہ اور مواخذہ اس قسم کی تخریبی اور انتقامی ذہنیت سے قطعاً پاک و صاف رہا جس کا مظاہرہ تحریکِ پاکستان کے شکست خوردہ مخالفین کی طرف سے مملکتِ پاکستان کے خلاف بظاہر تنقید لیکن درحقیقت بنظرِ تخریب ہوتا چلا آ رہا ہے۔

مملکتِ پاکستان کی زندگی کے گذشتہ چوبیس سالوں میں طلوعِ اسلام نے اسی نقطۂ نظر کے تحت اپنے کالموں میں جو کچھ لکھا ہے وہ اس تحریک کے مخلص ترین رفیقِ سفر کے فریضۂ رفاقت کی ایک پکار ہے۔ آیئے اس سلسلہ تحریر کا جستہ جستہ ملخص اربابِ اقتدار کو دیئے گئے مشوروں اور حالات و واقعات کی رفتار میں گذرے ہوئے ایام کی کچھ یادیں ازسرِ نو تازہ کریں۔

اربابِ حکومت کے نام

طلوعِ اسلام نے جنوری فروری ۱۹۴۸ء کے شمارہ (یعنی دورِ پاکستان کی اولین اشاعت) میں حکامِ پاکستان کو بیداری کا پیغام دیتے ہوئے لکھا۔

"وہ انگریز چلا گیا لیکن ..... اس کے نظامِ حکومت نے تمہارے قلب و دماغ کو جن سانچوں میں ڈھال دیا تھا تم نے انہیں بدستور قائم رکھا ہے بلکہ وہ برائیاں جو پہلے پھر بھی کسی حد تک انگریز کے خوف یا شرم سے دبی دبی سی رہتی تھیں ابھر اور نکھر کر اوپر آ گئیں۔ خارجی دنیا میں پوری کی پوری بساطِ سیاست و حکومت بدل گئی لیکن تمہارے قلب و نگاہ کی دنیا میں قطعاً کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ وہی اپنوں سے بیگانگی و مغائرت، وہی مصنوعی رعب و داب، وہی خوشامد پرستانہ مسلک، وہی فریب کارانہ مشرب، وہی حیلہ جوئی اور کامچوری، وہی نالائقی اور نااہلی، وہی خیانت و بددیانتی، وہی اعزہ پروری و جنبہ داری، وہی ظلم و استبداد، وہی جور و ستم۔ کوئی دادخواہ نہیں جو تمہارے ہاتھوں نالاں نہ ہو۔ کوئی ستم رسیدہ نہیں جو تمہاری نازیبائی سلوک کا شکوہ سنج نہیں .....

یاد رکھو! اگر تم نے خود اپنے آپ کو نہ بدلا تو خدا کا نہ بدلنے والا قانون تمہیں بدل دیگا اور اس کا بدلنا ایسا ہوتا ہے کہ اس میں تختہ الٹ جایا کرتا ہے۔"

اعیانِ ملت سے

اس کے بعد اس نے اعیانِ قوم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ ضرورت اس امر کی ہے کہ:-

(۱) بھک سے اڑ جانے والے جذبات سے الگ ہو کر ٹھنڈے دل سے تمام حالات کا جائزہ لیا جائے اور مختلف اسباب و علل کا صحیح صحیح تجزیہ کیا جائے۔ جو جو غلطیاں ہم سے ہوئی ہیں اُن کا کشادہ ظرفی سے اعتراف کیا جائے اور اس طرح اسے آئندہ اصلاح کا ذریعہ بنایا جائے۔

(۲) اس خطۂ ارض کے تحفظ و استحکام کا پورا پورا سامان کیا جائے جسے اللہ نے اپنی ذرہ نوازیوں کے صدقہ ہماری وراثت میں دے دیا ہے اور جس میں ہمیں ایسی امکانی قدرت حاصل ہو گئی ہے کہ ہم چاہیں تو یہاں قرآنی تصورات کے مطابق اپنی دنیا کی تشکیل کر لیں۔

(۳) منافقین (قوم پرست مسلمانوں) کے اس طائفہ کو جو کسی نہ کسی طرح تپ دق کے جراثیم کی طرح ہماری ہڈیوں کے گودے کے اندر تک پہنچ چکا ہے اور اب ناصحینِ مشفق کے لباس میں دشمن کی سازشوں کو کامیاب بنانے میں مصروف ہے، جلد از جلد بے نقاب کر کے اپنوں سے الگ کیا جائے۔

(۴) جو نالائق اور بد دیانت گروہ حالات سے ناجائز فائدہ اٹھا کر مسانیدِ اقتدار پر متمکن ہو چکا ہے انہیں اس کی صحیح قدر و قیمت کا آئینہ دکھا کر ان کے اصلی مقام تک لوٹا دینے کا انتظام کیا جائے اور اس کے ساتھ ہی نوجوان طبقہ کی تطہیرِ فکر اور تربیتِ قلب اس انداز سے کی جائے کہ وہ حکومت کے بارِ عظیم کے اہل ہو جائیں۔

(۵) گذشتہ حوادث و نوازل نے قوم کی اقتصادی حالت کو جس درجہ پست کر دیا ہے اس کا صحیح اندازہ کر کے اس کمی پورا کرنے کے اسباب و ذرائع پر غور کیا جائے۔

(۶) اس انقلاب کو جو اس وقت ضمیرِ عوام میں پہلو بدل رہا ہے صحیح خطوط پر متشکل کر کے ایسی صورت پیدا کی جائے کہ یہ انقلابی روح، صحیح قیادت اور تعیینِ منزل کے فقدان سے تعمیری نتائج مرتب کرنے کے بجائے مزید تخریب و اختلال کا موجب نہ بن جائے اس کے لئے عوام کے قلب و نگاہ کی تربیت، منزلِ مقصود کا واضح اور غیر مبہم تعین اور اس تک پہنچانے والے صراطِ مستقیم کی روشن نشاندہی کی جائے۔

(۷) اربابِ اقتدار کو بتایا جائے کہ وہ اپنا نصب العین، جذبۂ حکومت کی تسکین کے بجائے فریضۂ خدمت کی ادائیگی قرار دیں اور عوام کو سمجھایا جائے کہ وہ اپنے حقوق کے مطالبہ کے ساتھ اس اہم حقیقت کو بھی فراموش نہ کریں کہ ان کے صرف حقوق ہی نہیں بلکہ کچھ فرائض بھی ہیں، اور حقوق و مواجب کا مستحق بھی وہی ہوتا ہے جو اپنے فرائض کو بطریقِ احسن بجا لائے۔

(۸) جو خطرہ اس وقت سر پر منڈلا رہا ہے اس کی مدافعت کے لئے پوری کی پوری قوم کو تیار کیا جائے اس لئے کہ اگر یہ خطۂ زمین ہی نہ رہا تو ہم بھی نہ رہ سکیں گے۔

(۹) اور ان مساعی کا ماحصل یہ ہو کہ جس غرض کے لئے یہ زمین کا ٹکڑا ہم نے حاصل کیا ہے، وہ غرض بطریقِ احسن پوری ہو جائے۔ اور وہ غرض اس کے سوا اور کیا ہے کہ اس خطۂ زمین میں بسنے والا مسلمان تمام دنیا کی غیر فطری غلامی کی زنجیریں کو توڑ کر فقط ایک اللہ کا محکوم ہو کر زندگی بسر کر سکے اور اس طرح پھر سے اس آئینِ کہن کو تازہ کر دے جسے چشمِ فلک نے ایک بار دیکھا اور اسے دوبارہ دیکھنے کے لئے آج تک سرگرداں ہے۔"

نظریۂ قومیت

ہندوستان میں مسلمانوں کا مطالبۂ آزادی اس دعویٰ پر مبنی تھا کہ ہندوستان کے مختلف صوبوں میں بسنے والے مسلمان ایک الگ قوم کے افراد ہیں اور غیر مسلم دوسری قوم کے افراد۔ یہ دعویٰ اس مطالبہ کی تائید میں بطورِ ایک وکیلانہ حربہ کے استعمال نہیں کیا گیا تھا بلکہ ایک حقیقت نفس الامری پر مبنی تھا اور وہ حقیقت یہ تھی کہ اسلام نے تمام مدعیانِ ایمان کو بلا امتیازِ حدود و مکانی ایک قوم قرار دیا ہے۔ یہ نظریۂ قومیت دینِ اسلام میں مسلمہ اصول اساس کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ اس طرف توجہ دلاتے ہوئے طلوعِ اسلام نے لکھا:۔

وہ ہمیں اپنے عوام پر پورا اعتماد ہے کہ وہ تحریکِ پاکستان کے دوران میں بھی اسلامی مطالبہ کے بدل حامی تھے، اور اب بھی ایک صحیح اسلامی معاشرے کا قیام دل سے چاہتے ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ ہم نے ان کی تعلیم و تربیت پر کوئی توجہ نہیں دی، نہ ہی اس تصورِ پاکستان کے زندہ رکھنے اور عام کرنے کا کوئی انتظام کیا۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر اس تصور کو

عام اور اس سے فضا کو اس طرح معمور کر دیا جائے کہ ہر شخص شعوری یا غیر شعوری طور پر اسے جذب کرتا جائے تو آج بھی اسلام کا رشتہ مشرقی اور مغربی پاکستان میں ایک مستحکم وحدت اور یگانگت کا موجب اور مغربی پاکستان میں سندھی اور پنجابی کے امتیاز کو مٹا کر ملی برادری کا محکم ذریعہ بن سکتا ہے۔ یہی وہ تصور ہے جو ہمارے اجتماعی ایمان کا مرکزی نقطہ ہے۔ اسی میں ہماری نجات وسعادت کا راز مضمر ہے۔ اسی سے پاکستان کا استحکام وابستہ ہے اور یہی ہمارے تمام دکھوں کا واحد علاج ہے۔ جن لوگوں نے پاکستان کو اس لئے حاصل کیا تھا کہ یہ اسلام کی تجربہ گاہ بن سکے ان کے کرنے کا کام یہی ہے کہ اس تصور کو زیادہ سے زیادہ حد تک عام کیا جائے حقیقت میں یہ کام حکومت کے کرنے کا تھا لیکن حکومتیں آتی اور جاتی رہیں مگر اس کی طرف کسی نے بھی توجہ نہ دی۔" (طلوعِ اسلام بابت مئی ۱۹۵۸ء صفحہ ...)

نظریۂ پاکستان

اسلامی نظریۂ پاکستان کی اصطلاح کے اس قدر کثرت سے استعمال ہونے کے باوجود آج تک یہ متعین نہیں کیا گیا کہ اس سے مراد کیا ہے۔ چنانچہ اب بھی یہ اصطلاح مبہم کی مبہم ہے۔ اس اصطلاح کی تفصیلات تو طول طویل ہیں لیکن اصولی طور پر اس کا مفہوم طلوعِ اسلام نے دو شقوں میں متعین کرتے ہوئے لکھا:۔

"(۱) اسلام میں قومیت کا معیار ایمان کا اشتراک ہے نہ کہ نسل اور وطن کا اشتراک۔ اس معیار کے مطابق ایک ہی مملکت میں بسنے والے مسلمان اور غیر مسلم ایک قوم کے افراد نہیں ہو سکتے۔ غیر مسلم مسلم قومیت کا جزو قرار نہیں پا سکتے۔ یہ اس بنیاد کی پہلی اینٹ تھی جس پر مطالبہ پاکستان کی عمارت استوار ہوتی تھی اور قرآنی نظامِ حیات کا اولین تصور۔

(۲) مملکت کی آزادی اور پابندی کے حدود ان اصولوں کی رو سے متعین ہوں گے جو خدا کی کتاب (قرآن مجید) میں محفوظ ہیں اور جن میں کسی قسم کا رد و بدل نہیں ہو سکتا۔ بالفاظ دیگر اسلامی مملکت قرآنی احکام و اصول کی حکمرانی کی ایجنسی ہوگی۔"

جہاں تک قرآن کریم کے آئین و قانون کی اساس ہونے کا تعلق ہے اس کے لئے حسنِ اتفاق سے زمین پہلے ہی سے ہموار ہو چکی ہے۔ مودودی صاحب جاتے جاتے ایک ایسا کام کر گئے ہیں جس سے اس راستے کے وہ پتھر خود بخود دور ہو گئے ہیں جنہیں وہ اور ان کے ہمنوا گذشتہ تئیس برس سے گاڑتے چلے آ رہے تھے۔ انہوں نے اس کا اعلان کیا کہ کتاب وسنت کی رو سے کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا جو تمام فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہو۔ انہوں نے اگرچہ یہ بات حنفی فرقے کی اکثریت کے ووٹ حاصل کرنے کے لئے کہی تھی لیکن بہرحال یہ ایک ایسی حقیقت کا اعتراف تھا جس نے راستہ کی مشکلات کا حل پیدا کر دیا۔ اب اس کے بعد مملکت کے آئین کے لئے دو ہی شکلیں باقی رہ جاتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہاں سیکولر نظام رائج ہو جائے اور دوسرے یہ کہ قرآن خالص کو آئین اور قانون کی اساس قرار دیا جائے۔"

دستورِ پاکستان

طلوعِ اسلام کے سامنے سوال یہ تھا کہ تشکیل پاکستان کے بعد سب سے پہلا قدم اسلامی دستورِ مملکت کی ترتیب و تدوین کا ہوگا ضروری تھا کہ اس کے لئے ذہنوں کو ہموار کیا جائے اور اس کے راستے میں جو الجھاؤ اور پیچیدگیاں حائل ہونے والی ہیں انہیں رفتہ رفتہ صاف کر دیا جائے تاکہ جب اس نظام کی عملی تشکیل کا وقت آئے تو اس کی ترتیب میں دقت پیش نہ آئے۔ چنانچہ پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی بننے کے بعد اس نے اراکین مجلسِ آئین ساز کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا۔

وہ پاکستان سرِدست ایک قطعۂ زمین ہے جس پر جس قسم کی عمارت ہم چاہیں تعمیر کی جا سکتی ہے۔ اس عمارت کا نقشہ مرتب کرنے اور سنگِ بنیاد رکھنے کا کام آپ کو تفویض کیا گیا ہے۔

لہٰذا سوچیے کہ کس قدر اہم ہے آپ کا فریضہ اور کتنی عظیم القدر ہے آپ کی ذمہ داری۔ اس نقشہ کی ایک ٹیڑھی لکیر اور اس سنگِ بنیاد کا ذرا سا غلط رُخ ساری کی ساری عمارت کو کچھ سے کچھ بنا دے گا۔ اس لئے غور کیجئے کہ آپ کو کس قدر حزم و احتیاط اور کس درجہ بصیرت و فراست سے کام لینا ہے۔ آپ میں ایسے افراد بھی ہیں جن کے ذہن میں سوائے مغربی ایوانوں کے اور کسی عمارت کا نقشہ نہیں اور ایسے بھی جن کی نگاہیں بار بار ہندوستان کے بتکدوں کی طرف اٹھتی ہیں۔

لیکن اسلام کا مطالبہ آپ سے کچھ اور ہے

وہ حریمِ پاکستان کی بنیادوں کو ان خطوط پر متشکل کرنے کا تقاضا کرتا ہے جن کی ابتداء آج سے پانچ ہزار سال پیشتر خطۂ حجاز کی بے برگ و گیاہ زمین پر ملتِ حنیفیہ کے موسسِ اعلیٰ حضرت خلیلِ اکبرؑ کے مقدس ہاتھوں سے ہوئی اور جن کی تکمیل جناب مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہ کے دستِ مطہر سے انجام پائی۔ جو دنیا میں خدا کا پہلا گھر کہلایا اور ارتقائے شرفِ انسانیت کا منتہیٰ ٹھہرا۔ اسلام اسی نمونے کی عمارت چاہتا ہے۔ اس کا مطالبہ تاسیس کا نہیں تجدید کا ہے۔ وہ آپ سے کوئی نیا ضابطۂ قوانین مرتب کرانا نہیں چاہتا۔ وہ صرف اس ضابطۂ خداوندی کی تنفیذ چاہتا ہے جو مسلمان کے لئے قیامت تک ایک مکمل آئینِ زندگی اور دستورِ حیات ہے ––– اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است!

اوروں کے نزدیک آزادی سے مفہوم فقط اس قدر ہے کہ وہ اپنے لئے آپ قانون بنا سکیں۔ لیکن مسلمانوں کے نزدیک آزادی سے صرف یہ مفہوم ہے کہ وہ اپنے خدا کے قانون کو رائج کر سکیں۔ اس لئے اگر آپ نے اس قانونِ ابدی کے علاوہ کوئی اور قانون منتخب کیا تو مسلمان کے نزدیک یہ آزادی نہیں ہوگی غلامی کی غلامی رہے گی۔ اور مسلمان کا سا اسی شعور اب اتنا بیدار ہو چکا ہے کہ وہ غلامی کی لعنتی زندگی سے رستگاری حاصل کر سکے خواہ وہ غلامی اپنوں ہی کی کیوں نہ ہو۔ قوم کیا کرے گی اسے چھوڑو۔ لیکن آپ کے ساتھ کیا ہوگا اسے سوچو اور اس کے لئے خدا کی یہ وعید ہر وقت سامنے رکھو جو اس قسم کے لوگوں کے حق میں آئی ہے جہاں کہا گیا ہے کہ ––– الم تر الی الذین . . . . وبئس القرار . (۱۴/۲۸-۲۹) کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہوں نے اللہ کی عطا فرمودہ نعمت کو کفر سے بدل دیا اور اس طرح اپنی قوم کو امن و تسکین اور سرفرازی و سربلندی کی جنت کی طرف لے جانے کے بجائے تباہی اور بربادی کے گھر میں جا اتارا۔ یعنی جہنم میں جو ٹھہرنے کے لئے نہایت بُری جگہ ہے" (جنوری، فروری ۱۹۷۲ء)

طلوعِ اسلام نے ان کارفرماؤں کے اس طبقہ کی نشاندہی کی جو تمام مواعید کو پسِ پشت ڈال کر اسلامی دستور سے گریز کی راہیں اختیار کر رہا تھا اور سیکولرازم کی حمایت میں مکروہ سازشیں بروئے کار لا رہا تھا۔ ان عناصر کے چہرے سے دلفریب نقاب الٹتے ہوئے طلوعِ اسلام نے اپنی مارچ ۱۹۷۲ء کی اشاعت میں لکھا:۔

منافقین سے

"اول الذکر گروہ سے جو "ایماندار بے ایمانوں" پر مشتمل ہے خطاب فضول ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی نظریں جلوۂ دانشِ فرنگ نے خیرہ کر رکھی ہیں اور جن کی نگاہوں میں کوئی ایسی چیز جچ نہیں سکتی جس پر لندن یا ماسکو کی مہر ثبت نہ ہو۔ ان کے نزدیک کوئی ایسا نظام قابلِ قبول نہیں ہو سکتا جو مغربی مادہ پرستی کے معیار پر پورا نہ اترتا ہو۔

دوسرا گروہ وہ ہے جسے ہم "بے ایمان ایماندار" کہہ سکتے ہیں ۔ .... یہ گروہ یا تو بزدل ہے کہ اپنے دلی معتقدات کے اظہار سے ڈرتا ہے یا فریب کار کہ اپنے موجودہ دنیاوی مراتب کو برقرار رکھنے کے لئے وہ بات کہتا ہے جس میں اسے زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کرنے کی امید ہو سکتی ہے .... اس بنا پر ہم پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اسلام وقرآن سے ان لوگوں کی والہانہ شیفتگی ایک فریب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی ۔ انہوں نے عوام کی نازک رگ کو پہچان لیا ہے ۔ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ عوام کے ذہن اس چیز کو سننے اور برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں جو ان کے قلوب کی گہرائیوں میں پوشیدہ ہے .... ان لوگوں سے ہم گزارش کریں گے کہ وہ قوم سے مذاق کرنا چھوڑ دیں ۔ ان کی قیادت کے ایوان ریت کے ستونوں پر استوار نہیں رہ سکتے ، اس لئے وہ جس قدر جلد اس فریب کاری ، طمع سازی اور منافقت کو ترک کر دیں ، بہتر ہے ۔"

فرد اور ملت کے روابط

اسلامی نظام کی بنیادی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے طلوعِ اسلام نے فروری ۵۳ء کی اشاعت میں لکھا ۔

"آجکل "اسلامی نظام" کا عام چرچا ہو رہا ہے اور پاکستان کے دستور کا مسئلہ زیرِ بحث ہے مختلف سمتوں سے کوشش ہو رہی ہے کہ یہ دستور ان کے منشا یا ان کے تصورات کے مطابق مرتب ہو ۔ لیکن آپ جس قسم کا جی چاہے دستور بنا لیجئے یہ حقیقت اپنی جگہ پر رہے گی کہ اسلامی نظام کی عملی تشکیل کی صورت صرف اسلامی تنظیم ہے ۔ جب تک آپ پوری کی پوری ملت کی تنظیم ان خطوط پر نہیں کریں گے ۔ اسلامی نظام کبھی صورت پذیر نہیں ہو سکے گا ۔ اسلامی نظام کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ ـــــ ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا

جب تک افرادِ ملت اس نظام میں برابر کے شریک نہیں ہوں گے ۔ یہ اسلامی نظام نہیں ہوگا ۔ اس نظام میں مرکزِ ملت اور افرادِ ملت میں غیر منقطع واسطہ ہونا ضروری ہے ۔ اس میں ہر فرد کی آواز مرکز تک پہنچنی چاہیئے اور مرکز کے فیصلے افراد کے ہاتھوں نافذ پذیر ہونے چاہئیں ۔ مرکز اور افراد کے درمیان کوئی حاجب اور دربان نہیں ہونا چاہیئے ۔ حضرت عمرؓ نے جب حکم دیا تھا کہ مصر کے گورنر نے اپنے مکان کے آگے جو ڈیوڑھی بنائی ہے اُسے مسمار کر دیا جائے تو وہ حکم اسی حقیقت کی ترجمانی کر رہا تھا ۔ وہی نظام ، نظامِ خداوندی کہلانے کا مستحق ہو سکتا ہے جس میں مرکز ہر فرد کی پکار سنے اور اس کا جواب دے ۔ جس نظام میں افرادِ ملت اور مرکز کے درمیان دیواریں کھڑی ہو جائیں وہ نظام کبھی نظامِ خداوندی نہیں کہلا سکتا ۔"

تھیا کریسی کے خلاف

قرار دادِ مقاصد پاس ہونے پر طلوعِ اسلام نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنی جولائی ۵۳ء کی اشاعت میں مشورہ دیا کہ :-

"..... طلوعِ اسلام متعدد بار لکھ چکا ہے کہ مجلسِ آئین ساز نے قرار دادِ مقاصد پاس کر کے اپنے لئے اور اس سے آگے بڑھ کر قوم اور ملک کے لئے ایک مستقل فتنہ کا باب کھول دیا ہے ۔ قرار دادِ مقاصد سے فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ اس کا فیصلہ کون کریگا کہ فلاں قانون کتاب وسنت یا شریعتِ اسلامی کے مطابق ہے یا نہیں ۔ اس کا ایک ہی جواب ہو سکتا تھا کہ اس کے لئے اربابِ شریعت یعنی مولوی صاحبان کی طرف رجوع کرنا ہوگا ۔ یہی وہ ضرورت تھی جس کے لئے بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ میں یہ سفارش کی گئی کہ مجلسِ مقننہ کے ساتھ علماء کا ایک بورڈ بھی

ہونا چاہیئے جو یہ فتوے دیا کرے کہ زیرِ نظر مسئلہ میں شریعت کا کیا ارشاد ہے؟ گویا عملاً قانون سازی اور قانون کی تعبیر کے پورے اختیارات مولوی صاحبان کے ہاتھوں میں دے دیئے جائیں۔ ..... ہم اس حقیقت کا بار بار اعلان کر چکے ہیں کہ اگر حکومت کے کاروبار میں ملاؤں نے مؤثر اقتدار حاصل کر لیا تو تھوڑے عرصہ میں پاکستان کی حالت افغانستان سے بھی بدتر ہو جائے گی۔ دوسری طرف ہم یہ بھی بار بار کہہ چکے ہیں کہ جس قسم کا مذہب ملا پیش کر رہا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ملک کا نوجوان طبقہ سرے سے مذہب ہی سے متنفر ہو جائے گا اور یہ کہہ اٹھے گا کہ مذہب ایک نجی مسئلہ ہے۔ اسے سیاست سے کوئی سروکار نہیں۔ اس خطرہ کے لئے ہمارے سامنے ترکی کی مثال موجود ہے۔ وہاں کے ارباب اقتدار کا یہ منشا ہرگز نہیں تھا کہ مذہب کو مملکت سے الگ کر دیا جائے لیکن جس قسم کا مذہب علماء کی طرف سے پیش کیا جاتا تھا وہ قطعاً اس قابل نہیں تھا کہ مملکت کے کاروبار کو ایک دن کے لئے بھی چلنے دے۔ وہاں کے ارباب بست و کشاد نے تنگ آکر یہ فیصلہ کر دیا کہ ایسے مذہب کو حجروں اور خانقاہوں تک محدود رہنا چاہیئے۔ مملکت کا کاروبار ملکی طریقوں پر سرانجام پائے گا۔"

غیر مسلموں کی حیثیت

مجلس قانون ساز میں غیر مسلموں کی شرکت اور مشاورت کے متعلق طلوعِ اسلام نے حکومت کو متنبہ کرتے ہوئے لکھا :۔

"ہم اس حقیقت کو پھر دہرائے دیتے ہیں کہ ایک اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کو آئین و قانون کے کاموں میں کبھی شریک نہیں کیا جا سکتا۔ پاکستان کے آئین کے معاملہ میں اس حقیقت کو کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔" (دسمبر ۱۹۵۳ء)

اس حقیقت کی مزید وضاحت کرتے ہوئے طلوعِ اسلام نے لکھا :۔

"اسلامی مملکت کی مجلس قوانین سازی کا فریضہ یہ ہے کہ وہ قرآنی اصولوں کی حدود کے اندر مملکت کے تقاضوں کے مطابق قوانین وضع کرے۔ اب ظاہر ہے کہ جو لوگ (یعنی غیر مسلم) قرآنی اصولوں کی صداقت کے قائل ہی نہ ہوں، انہیں ان اصولوں کے مطابق قوانین سازی کے کام میں شرکت کرنا قرآنی اصولوں کا مضحکہ اڑانا اور خود ان لوگوں کو منہ چڑانا ہے، جو ان اصولوں کو مانتے ہیں۔ ..... ہمیں امید ہے کہ زیرِ تجویز کانسٹی ٹیوشن اس مسئلہ کو کما حقہٗ اہمیت دے گا اور اپنی سفارشات میں اس امر کی وضاحت کر دیگا کہ پاکستان کا آئین اسلامی آئیڈیالوجی پر مبنی ہے اس لئے جو لوگ اس آئیڈیالوجی کو نہیں مانتے وہ ان لوگوں کے ساتھ اصولی طور پر کس طرح شرکت کر سکتے ہیں، جو اس آئیڈیالوجی کی صداقت پر ایمان رکھتے ہیں۔"

دستورِ پاکستان

دستورِ حیات کا انتخاب درحقیقت کسی قوم کے ارادوں کا آئینہ ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں طلوعِ اسلام نے نہایت وضاحت سے فیصلہ کن انداز میں حکومت کو یاد دہانی کراتے ہوئے لکھا۔

"..... مستقبل کا فیصلہ اس امر پر موقوف ہے کہ یہ اپنے لئے کس قسم کا دستورِ حیات تجویز کرتے ہیں۔ اس لئے کہ دستورِ حیات کا انتخاب درحقیقت کسی قوم کے ارادوں کا آئینہ ہوتا ہے۔ ایک دستورِ حیات وہ تھا جو انہیں ابدی حقیقتوں کی شکل میں دیا گیا اور جسے حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے پاکباز رفقاءؓ کی جماعت نے عمل کر کے دنیا کے سامنے زندگی کا صحیح معیار پیش کر دیا۔ دوسرا دستورِ حیات وہ تھا جسے یہودیوں کے ربیوں، عیسائیت کی خانقاہوں ــــ اور مجوسیوں کے آتشکدوں کے اقنومِ ثلاثہ نے مرتب کیا اور ملوکیت، ملائیت اور پیر پرستی کے نگاہ فریب پردوں میں چھپا کر مسلمانوں کے قلب و دماغ پر مسلط کر دیا۔ یہ وہ دستورِ حیات ہے جو قرنِ اول کے بعد سے اس وقت تک جسدِ ملت سے زندگی کی حرارتوں کو سلب کرنے کا موجب بنا رہا ہے اور جسے رجعت پسند عناصر مذہب کے مقدس لباس میں پیش کرتے

چلے آرہے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ مسلمان اس دستور کو اپنی زندگی کا ضابطہ بنانا چاہتا ہے جسے محمد رسول اللہ والذین معہ نے تیار کیا تھا، اور جس سے شہداء علی الناس (تمام نوعِ انسانی کے اعمال کے نگران) کے منصبِ جلیلہ پر فائز ہو گئے تھے یا اس دستور کو اختیار کرنا چاہتا ہے جو عجمی سازشوں کا وضع کردہ، ان کے عہدِ ملوکیت کی یادگار اور رجعت پسند عناصر کی خوئے مردہ پرستی کی تسکین کا موجب ہے اور جس نے اس قوم کو زندگی اور اس کی حرارتوں سے اس طرح محروم کر رکھا ہے۔ کانّہٗ لم یکن شیئًا مذکورًا۔

یہ سوال بڑا صاف اور نکھرا ہوا ہے اور اسی کے جواب پر پاکستان کے مسلمانوں کے مستقبل کا دارومدار ہے۔ اگر انہوں نے اس دستور کو اپنا ضابطۂ حیات تجویز کر لیا جس کی بنیاد قرآن کی ابدی صداقتوں پر ہے تو انہیں ان کی چھنی ہوئی عظمتیں اور لٹی ہوئی ثروتیں پھر سے مل جائیں گی۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ہو سکتا ہے کہ یہ اقوامِ عالم کی امامت کے بھی شایانِ شان قرار پا جائیں۔"

(فروری ۱۹۵۰ء)

اسلامی آئین کے اصول و مبانی

اسلامی آئین کی ترتیب کے سلسلہ میں طلوعِ اسلام نے اس کے طریق کار کی تفصیلی طور پر نشاندہی کرتے ہوئے اپریل ۱۹۵۰ء کے شمارہ میں حکومت کو مشورہ دیا۔

"(۱) پاکستان کے لئے اسلامی آئین کا مرتب کر لینا کچھ مشکل نہیں بشرطیکہ اس مسئلہ کو صحیح خطوط پر سمجھا جائے اور اس کے لئے صحیح راستے پر اقدامات کئے جائیں۔

(۲) اس کے متعلق یہ خیال دل سے نکال دیا جائے کہ (اسلامی آئین) ہمارے مذہبی پیشوا مرتب کریں گے اور اس کی ترتیب و تدوین میں ان کا عمل دخل ہرگز نہیں ہے۔ اگر ہم نے ایسا سمجھ لیا تو اسلامی آئین قیامت تک بھی مرتب نہیں ہو سکے گا۔

(۳) اسلامی آئین قرآن کے غیر متبدل قوانین (مستقل اقدار) کے مطابق مملکت کا منتہیٰ و مقصود متعین کرے گا اور اس کے حصول کے لئے حدود و شرائط کی نشاندہی کرے گا۔ ان حدود و شرائط کے اندر رہتے ہوئے، عملی اقدامات ملّت کے باہمی مشورے سے طے ہوں گے۔

(۴) اس مقصد کے لئے ضروری ہے کہ ایک کمیشن مقرر کیا جائے جو پاکستان کی آئیڈیالوجی اور اسلامی مملکت کے اصول و مبانی کے متعلق (فرقہ وارانہ اثرات سے بلند ہو کر) تحقیق کرے اور اس کی سفارشات کی روشنی میں آگے قدم اٹھایا جائے۔

(۵) ملک سے مذہبی فرقہ وارانہ تقسیم کو ختم کر کے امتِ واحدہ کی تشکیل مملکت کا فریضہ قرار پائے اور اس منتہیٰ تک بتدریج پہنچا جائے۔ اس کا مؤثر اور کامیاب طریق یہ ہے کہ ہم اپنے نظامِ تعلیم میں بنیادی تبدیلی پیدا کریں۔ جداگانہ مذہبی مدارس اور دارالعلوموں کو ختم کر کے صحیح دینی تعلیم مدرسوں اور کالجوں میں دی جائے اور اس کی بنیاد قرآن کریم اور اس کی روشنی میں اسوۂ حسنۂ نبی اکرمؐ کو قرار دیا جائے۔

مذہبی پیشواؤں کی معاش کا مسئلہ

(۶) ہمارے موجودہ اربابِ مذہب کی روزی کا باعزت اور معقول انتظام کیا جائے اور انہیں اس قسم کے خیالات کے نشر و اشاعت کی اجازت قطعاً نہ دی جائے جن سے فرقہ وارانہ کشیدگی بڑھے اور مذہبی گروہ بندی کی گرہیں مضبوط ہوتی جائیں۔"

طلوعِ اسلام نے اپنے اسی شمارے میں لکھا۔

اگر یہ تجربہ ناکام رہا تو .....

" آئین کا معاملہ بچوں کا کھیل نہیں۔ اس کا تعلق قوم کی پوری زندگی اور آنے والی

نسلوں کے مستقبل سے ہے۔ نہ ہی یہ مذہبی مناظرہ ہے کہ اس میں لفظی گورکھ دھندوں سے اپنے متبعین کو خوش کر لیا جائے۔ یہ ایک مخصوص تجربہ ہے جسے (تیرہ سو سال کے بعد) پہلی مرتبہ عمل میں لایا جا رہا ہے اور جس کی طرف ساری دنیا کی آنکھیں لگی ہوئی ہیں۔ اگر یہ تجربہ کامیاب ہو گیا تو دنیا اس نتیجہ پر پہنچے گی کہ اسلام ایک ممکن العمل ضابطۂ زندگی ہے جو آج بھی اپنے نتائج مرتب کر سکتا ہے۔ اگر یہ ناکام رہا تو (دنیا ہمارے متعلق جو رائے قائم کرے سو کرے) خود اسلام کے متعلق یہ سمجھا جائے گا کہ یہ کسی دور میں تو قابلِ عمل تھا لیکن اب اس میں یہ صلاحیت نہیں کہ یہ زمانے کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دے سکے۔ ان حالات میں یہ مسئلہ سطحی جذبات کی رُو سے طے کرنے کا نہیں، کامل غور و فکر اور متانت و سنجیدگی کے ساتھ حل کرنے کا ہے۔"

آئین کے مسودات

واضح رہے کہ آئین سازی کے سلسلہ میں طلوعِ اسلام نے اتنا ہی نہیں کیا کہ اربابِ حکومت اور مجالسِ دستور ساز کو ضروری مشورے دیئے۔ اس نے ہر آئین ساز اسمبلی کو اسلامی دستورِ پاکستان کے مکمل اصول و ضوابط مرتب کر کے دے دیئے اور انہیں ہزارہا کی تعداد میں ملک میں پھیلا دیا۔ اس نے موجودہ آئین ساز اسمبلی کے لئے بھی تمام آئین مرتب کر کے دے دیا ہے اور اس کی اشاعت بھی عام کی ہے۔ اس دستور کا کتابچہ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں شائع کیا گیا ہے۔

مخلوط انتخاب

مخلوط انتخاب نظریۂ پاکستان کی ضد ہے اور دو قومی نظریہ کے علی الرغم۔ ہمارے سربراہوں نے ایک طرف عملی طور پر اسے تسلیم کر لیا اور دوسری طرف وہ عوام کو یہ کہہ کر دھوکا دیتے رہے کہ وہ قائداعظمؒ کے وارث اور نظریۂ پاکستان کے سب سے بڑے علمبردار ہیں۔ اس کھلی منافقت پر تنقید کرتے ہوئے طلوعِ اسلام نے اپنی نومبر ۵۶ء کی اشاعت میں لکھا:

"سمجھ میں نہیں آتا کہ ان ذہنوں کے متعلق کیا کہا جائے جن میں مخلوط انتخاب کا یہ باطل افروز تصور پیدا ہوا۔ ان زبانوں کے متعلق کن الفاظ میں گفتگو کی جائے جنہوں نے اس اسلام سوز فتنے کو آگے پھیلایا، اور ان ہاتھوں کا ذکر کس انداز سے کیا جائے جو اس زہر آلود خنجر کو سینۂ ملّت میں پیوست کرنے کے لئے یوں بے باکانہ اُٹھ رہے ہیں۔ . . . اگر دستور میں مخلوط انتخاب جیسے غیر اسلامی تصورات کو ٹھونس دیا گیا تو ہم واضح الفاظ میں کہہ دینا چاہتے ہیں کہ یہ چیز زیادہ عرصہ تک نہیں چل سکے گی۔ . . . اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام کے اصولوں سے انحراف کے باوجود جس دستور کو آپ اسلامی کہہ کر مرتب کریں گے قوم اُسے اسلامی سمجھ کر بسر و چشم قبول کر لے گی تو یہ آپ کی بھول ہے۔"

وحدتِ ملّت، صوبائیت، مذہبی فرقے اور سیاسی جماعتیں

ہندوستان میں مسلمانوں کا مطالبۂ آزادی اس دعوے پر مبنی تھا کہ ہندوستان کے مختلف صوبوں میں بسنے والے مسلمان ایک الگ قوم کے افراد ہیں اور غیر مسلم دوسری قوم کے افراد۔ یہ دعویٰ اس مطالبہ کی تائید میں بطور ایک سیاسی حربے کے استعمال نہیں کیا جاتا تھا بلکہ ایک حقیقت نفس الامری پر مبنی تھا۔ اور وہ حقیقت (جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے) یہ تھی کہ اسلام نے تمام مدعیانِ ایمان کو بلا امتیاز حدود مکانی ایک قوم قرار دیا ہے۔ طلوعِ اسلام نے اس دعویٰ کی تائید میں قرآنی شہادت دیتے ہوئے اربابِ حکومت کی توجہ دلاتے ہوئے لکھا:

"وحدتِ ملّت کے ضمن میں ایک نقطہ ایسا ہے جس کی طرف اربابِ حکومت کی توجہ خاص طور پر دلانا ضروری ہے:

وحدتِ ملت

ضروری ہی نہیں بلکہ اشد ضروری ہے۔ اس حقیقت کو ہم میں سے ہر شخص دن میں دس مرتبہ دہراتا ہے کہ اسلام نسب، نسل، قوم، وطن، رنگ، زبان کے تمام امتیازات کو مٹا کر، معیارِ تکریم صرف جوہر ذاتی و تقویٰ کو قرار دیتا ہے۔ یہ اسلام کی بنیادی تعلیم ہے اور قرآن کی نصِ صریح۔ یہ وہ حقیقت ہے جس میں دو رائے ہو ہی نہیں سکتیں۔"

طلوع اسلام نے حکومت پاکستان کو مشورہ دیتے ہوئے دسمبر ۱۹۵۱ء کی اشاعت میں تحریر کیا:

صوبائیت کی لعنت

"اگر آپ دل سے چاہتے ہیں کہ پاکستان قائم ہو جائے تو بنیادی طور پر چند تبدیلیاں فوری کرنی پڑیں گی۔

(۱) تمام صوبوں کو توڑ کر ساری مملکت کو مرکزی نظام کے ماتحت لے آیئے۔ اس سے وہ طبقہ جو بعض پارٹیوں کے زور پر برسرِ اقتدار آ گیا ہے اور اب شجرِ حکومت پر اکاس بیل کی طرح چھا رہا ہے (کہ بیل تو ترو تازہ ہو رہی ہے اور درخت دن بدن سوکھتا جا رہا ہے) الگ ہو جائے گا اور ساتھ ہی اخراجاتِ حکومت میں بڑی کفایت ہو جائے گی۔

(۲) مرکزی کابینہ کو وسیع کیجئے لیکن معیارِ انتخاب یہ رجحان نہ قرار پائے کہ کس کے تعین سے کونسی پارٹی خوش ہو گی۔

(۳) ایک ایک منسٹر کے ساتھ کم از کم چار چار نوجوان تعلیم یافتہ صاحبِ دل و دماغ سیکرٹری ملحق کر دیجئے۔

(۴) فنی شعبوں کو بعض منسٹروں تک ہی محدود نہ کیجئے پبلک میں سے صاحبِ درک لوگوں پر مشتمل مجالسِ غور کی تعین کیجئے تاکہ تمام امور میں منسٹروں کو مشورہ دے سکیں۔

(۵) یہ سمجھ لیجئے کہ ہم زمانہ جنگ سے گزر رہے ہیں اس لئے کام کی رفتار اسی نہج سے مقرر کیجئے۔

(۶) مرکز کے موجودہ افسروں کو بتدریج اضلاع میں تبدیل کر کے ان کی جگہ نئے افسر متعین کیجئے۔ اطلاعات کے مطابق یہاں پارٹی بازی اس قدر شدید اور محکم صورت اختیار کر چکی ہے کہ اگر کچھ وقت اور یہی صورتِ حال رہی تو حکومت کی خیر خواہ کار پردازانِ حکومت کے ہاتھوں سے تہس نہس ہو جائے گی۔

(۷) قوم پاکستان کے تحفظ کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دینے کے لئے تیار ہے لیکن قوم کا اعتماد حاصل کرنے اور ان سے ربط پیدا کرنے کی کوشش اس وقت تک نہیں کی گئی۔ اس کی طرف فوری توجہ دیجئے۔

عسکری تربیت

(۸) عسکری تربیت (ملٹری ٹریننگ) لازمی کر دیجئے۔"

۱۹۵۴ء میں حکومتِ پاکستان نے فیصلہ کیا کہ مرکزی حکومتوں کی ملازمتوں میں مشرقی اور مغربی پاکستان کی نیابت الگ الگ ہو اور تمام اسامیاں دونوں خطوں کے مسلمانوں میں نصف نصف بانٹ دی جائیں۔ چنانچہ صوبائی تقسیم کے اس شجرِ ملعونہ اور حکمتِ فرعونی کے اس ابلیسی کارنامہ پر طلوع اسلام نے تنقید کرتے ہوئے متنبہ کیا اور اگست ۱۹۵۴ء کی اشاعت میں لکھا:۔

صوبوں کو ختم کر دیجئے

"یاد رکھیئے! ہماری مستحکم اور پائندہ حکومت اسی صورت میں قائم ہو سکے گی جب ہم ان صوبائی نسبتوں سے بلند ہو کر صرف اسلامی نسبت کو پیشِ نظر رکھیں اور کسی کو کبھی خیال تک بھی نہ گذرے کہ فلاں شعبہ میں ہماری نمائندگی کس قدر ہے۔ صوبوں کی لکیریں محض نظم و نسق کی سہولت کی خاطر کھینچی گئی تھیں نہ کہ ملک کے باشندوں میں تفریق پیدا کرنے کے لئے۔ اگر یہ لکیریں اس قسم کی تفریق کے خطوط بن رہی ہیں تو ان لکیروں کو جس قدر

جلد مٹا یا جائے کہ اتنا ہی اچھا ہے تاکہ — ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے

ملت میں تفرقہ انگیزی کا بنیادی سبب صوبوں کا وجود ہے۔ صوبے ہمارے لیڈروں کی ہوسِ اقتدار اور حصولِ مناصب ومدارج کو بڑھانے کا موجب بنے ہیں۔ انگریزوں نے اپنے مفادات کی غرض سے ملک کو صوبوں میں تقسیم کیا تھا۔

ملک میں فیڈرل طرز کی حکومت کی تشکیل کی آوازیں بلند ہوئیں تو طلوعِ اسلام نے مارچ ۱۹۵۳ء میں تجویز پیش کی۔

فیڈرل حکومت کیخلاف

"فیڈرل اندازِ حکومت اس غیر اسلامی صوبائی عصبیت کو مضبوط بنانے کا ایک مستقل ذریعہ ہے۔ یہ انداز اسلام کے مزاج کے یکسر خلاف ہے ...... پاکستان میں فیڈرل انداز کی حکومت سے صوبائی قومیتیں آہستہ آہستہ مستند ہو جائیں گی اور اس چھوٹے سے خطۂ زمین میں بھی مسلمانوں کی وحدت قائم نہ ہو سکے گی چہ جائیکہ ساری دنیا کے مسلمانوں میں وحدت قائم ہو جائے جو اسلام کا منشاء ہے۔"

محترم پرویز صاحب نے ۱۹۶۸ء میں مشرقی پاکستان کا دورہ کیا۔ وہاں کے حالات کا بغور جائزہ لینے کے بعد موصوف نے جن حقائق کی نشاندہی اکتوبر ۱۹۶۸ء کے طلوعِ اسلام میں کی وہ یہ تھی:۔

مشرق و مغرب میں کانفیڈریشن

"اب ہمارے خیال میں صورتِ حال ایسی پیدا ہو چکی ہے کہ وحدانی انداز کی حکومت بھی شاید کامیاب نہ ہو سکے۔ اس لئے اب ہماری تجویز یہ ہے کہ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کو دو خود مختار وحدتیں تسلیم کر کے ان میں کانفیڈریشن پیدا کر دی جائے جس میں زراعتی مابین سے مشترکہ مسائل اکٹھے رکھ لئے جائیں۔ اس کے ساتھ ہی مغربی پاکستان کے تمام صوبوں کو مٹا کر پورے ملک میں ایک حکومت قائم کی جائے۔"

پاکستان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کی اندرونی اور بیرونی سازشوں کو بے نقاب کرتے ہوئے طلوعِ اسلام نے ملک کے اربابِ بست وکشاد سے درخواست کی کہ وہ اس ڈھونگ کو ایک بڑا فتنہ بننے سے پہلے کچل دے۔ اس نے اپنی ۱۸ نومبر ۱۹۶۷ء کی ہفت وار اشاعت میں لکھا:۔

تحریک پختونستان

"تحریک پختونستان کے سلسلہ میں بیرونی ممالک میں کیا کچھ کیا جا رہا ہے اور اس کے پردے میں پاکستان کے خلاف کس قدر زہر پھیلایا جا رہا ہے، ہمیں معلوم نہیں کہ حکومتِ پاکستان نے اس زہر آلود پروپیگنڈا کے ازالہ کے لئے کیا کچھ کیا ہے اور کیا کچھ کر رہی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ ہمیں اب اس مسئلہ کو محض ایک مقامی مسئلہ سمجھ کر اس کی طرف سے بے اعتنائی نہیں برتنا چاہیئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ فتنہ عالمگیر بھی ہے اور زمین گیر بھی، لہٰذا اس کے انسداد کے لئے اسی قسم کی عالمگیر کوششوں کی ضرورت ہے۔ اس سلسلہ میں افغانستان نے جو رویہ اختیار کر رکھا ہے وہ خود اس امر کی شہادت ہے کہ ڈاکٹر اوننگ شاہ نے جو کچھ ستمبر ۱۹۶۵ء میں کہا تھا وہ محض پروپیگنڈہ کا ڈھونگ نہیں تھا بلکہ حقیقت پر مبنی تھا۔ معلوم ہوتا ہے یہ کھچڑی اندر ہی اندر بہت دیر سے پک رہی تھی۔ اور اب اسے اس شکل میں ابھارا جا رہا ہے۔ جب انہیں بزعمِ خویش اس کا یقین ہو گیا ہے کہ اگر انہوں نے اس سوال کو آگے بڑھایا تو بعض گوشوں سے انہیں یقیناً اس کی تائید حاصل ہو جائے گی۔

ہم پاکستان کے اربابِ بست وکشاد سے درخواست کریں گے کہ وہ کشمیر کے مسئلہ سے عبرت حاصل کریں اور اس نئے فتنے کے استیصال میں تعویق سے کام نہ لیں۔ مسئلہ کشمیر نے ہمیں یہ سبق دیا ہے کہ ان معاملات میں تاخیر دشمن کے

حق میں اور ہمارے خلاف جاتی ہے۔ لہذا ضرورت ہے کہ اس کے متعلق ایک دفعہ بیٹھ کر پختہ فیصلہ کر لیا جائے اور پھر اس فیصلے پر عمل درآمد کرنے کے لئے پوری ہمت سے کام لیا جائے۔ یہ مسئلہ (مسئلہ کشمیر) کے مسئلہ کی طرح پاکستان کی موت اور زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ پاکستان کا ہر بچہ خواہ اس پار ہو یا اُس پار، ہر قسم کی قربانی کے لئے تیار رہے گا۔"

مذہبی فرقہ بندی

قرآن کریم کے واضح احکامات کے مطابق امت میں تفرقہ سازی شرک ہے۔ فرقہ سازی کی بنیاد شخصیت پرستی پر استوار ہوتی ہے۔ تفرقہ بازی میں ہمارے ہاں کے علماء کو بڑا مقام حاصل ہے۔ طلوع اسلام نے اپنی جولائی ۱۹۴۹ء کی اشاعت میں تحریر کیا کہ تفرقہ کو مٹانا حکومت کی ذمہ داری ہے۔ اس نے حکومت کی توجہ اس طرف مبذول کراتے ہوئے لکھا:۔

"امت میں تمام فرقے علماء کا پیدا کردہ ہے۔ انہی تفرقوں میں ان کی اپنی ہستی کا راز پوشیدہ ہے۔ ان حضرات سے یہ توقع رکھنا کہ یہ تفرقہ مٹا کر وحدت پیدا کر دیں گے انتہائی خوش فہمی ہے۔ جو حضرات ان تمام مفسدہ انگیزیوں اور خونریزیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود جو امت کے لئے وجہ ہلاکت بنتی چلی آرہی ہیں اتنی سی بات پر بھی متفق نہ ہو سکے کہ نماز میں ہاتھ کھلے رکھنے چاہئیں، سینہ پر باندھنے چاہئیں یا زیر ناف۔ وہ اپنے تمام اختلافات مٹا کر ایک امت کیسے بن سکتے ہیں؟ جس زمانے میں پاکستان کا آئین زیر ترتیب تھا مختلف فرقوں کے (اکتیس) علماء کراچی میں جمع ہوئے تھے۔ یہ حضرات اپنے اس اجتماع کا تذکرہ بڑے فخر سے کرتے ہیں۔ اس اجتماع میں انہوں نے ایک مطالبہ متفقہ طور پر پیش کیا تھا وہ مطالبہ یہ تھا کہ ان کے مختلف فرقوں کو آئینی طور پر تسلیم کر لیا جائے۔ سو جن حضرات کا اتفاق فرقوں کی گرہوں کو مضبوط کرنے کے لئے عمل میں آئے وہ فرقوں کو مٹا کر وحدت کس طرح پیدا کر سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے امت میں تفرقہ کو روکنے اور وحدت قائم رکھنے کی ذمہ داری افراد کے بجائے حکومت کے سر عاید کی ہے۔ یہ اسلامی حکومت کا فریضہ ہے کہ وہ امت میں فرقے پیدا نہ ہونے دے اور جب پیدا ہو چکے ہوں تو انہیں ختم کر کے امت میں وحدت پیدا کرے۔ بظاہر یہ کام بڑا مشکل نظر آتا ہے لیکن درحقیقت یہ ایسا مشکل نہیں ہے۔

قرآن ہی امت کی وحدت کی بنیاد بن سکتا ہے۔ وہ اس طرح کہ:۔

(۱) دین میں سند و حجت قرآن کو تسلیم کر لیا جائے۔

(۲) جو کچھ اس وقت ہمارے ہاں مذہب کے نام سے مروج ہے اسے قرآن کی روشنی میں پرکھا جائے۔ جو کچھ اس کے مطابق ہو اُسے رکھ لیا جائے جو اس کے خلاف ہو اُسے مسترد کر دیا جائے۔

(۳) قانون سازی کے سلسلہ میں اس حقیقت کو تسلیم کر لیا جائے کہ غیر متبدل قرآنی اصول (یا احکام) ہیں۔ امت کو یہ حق حاصل ہے کہ ان اصولوں کی روشنی میں اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق اپنے لئے جزئی قوانین خود وضع کرے۔ ان قوانین میں عند الضرورت تغیر و تبدل کیا جا سکے گا لیکن قرآن کے اصول و احکام غیر متبدل رہیں گے۔"

جمہوریت اور اسلام

کہا جاتا ہے کہ اسلام سراسر جمہوریت ہے اور جمہوریت کے نشوو ارتقا کے لئے سیاسی پارٹیوں کا وجود ناگزیر ہے۔ ان پُر فریب نعروں کی نقاب کشائی کرتے ہوئے طلوع اسلام اس موضوع پر بار بار قرآنی روشنی ڈالتا رہا ہے۔ مذہب اور مغربی جمہوریت کے نقاب میں ملک دشمن اور مفاد پرست طبقہ جس طرح سر ابھار رہا ہے ابتدا ہی سے طلوع اسلام نے حکومت کی توجہ اس طرف مبذول کرائی ہے۔ اس نے اپریل ۱۹۵۱ء

کی اشاعت میں حکومت کو مشورہ دیا تھا ۔

وہ ہم حکومتِ پاکستان کو ایک بار پھر متنبہ کر دینا چاہتے ہیں کہ انہوں نے جمہوریت کا یہ مفہوم بالکل غلط سمجھا ہے کہ جن لوگوں کے متعلق یقینی طور پر معلوم ہے کہ وہ مملکتِ پاکستان کے کس قدر کھلے دشمن ہیں انہیں پاکستان دشمنی کے منافقانہ دعاوی کی آڑ میں اس قسم کی سازشوں کی اجازت دی جائے جس سے اس نوزائیدہ نظام کی بنیاد میں متزلزل ہو جائیں۔ ضرورت

کمیونسٹ

ہے کہ جونہی کسی عنصر نظم و نسق اور سلطنت میں کسی نہ کسی طرح دخیل ہو گیا ہے یا جو کمیونسٹ عنصر عوام کو آئین شکنی اور امن سوزی کے لئے بھڑکا رہا ہے اور مظاہرات اور اشتعال انگیز اسباب و ذرائع سے حکومت کی مشینری میں روڑے اٹکانے کی کوشش کرتا ہے آہنی گرفت سے اس کا مقابلہ کیا جائے۔ تاکہ قبل اس کے کہ اس کی جڑیں زمین میں گہری ہو جائیں اس فتنہ کا استیصال ہو جائے ۔"

مغربی جمہوریت کی سیاہ کاریوں اور ان کے تباہ کن نتائج پر روشنی ڈالتے ہوئے طلوعِ اسلام نے بالتفصیل بار بار

سیاسی پارٹیاں

توجہ مبذول کرائی ہے ۔ اس نے حزبِ اقتدار اور حزبِ اختلاف کی اہلیت کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ۔

وہ قرآنِ کریم کے ارشاد کے مطابق دنیا میں دو ہی پارٹیاں تھیں مسلم اور غیر مسلم ۔ خود مسلمانوں میں کسی پارٹی کا وجود یا تصور نہ تھا۔ وہاں ایک حزب اللہ تھا اور دوسری حزب الشیطان ۔

ہمارے یہاں ایک بڑی بدنصیبی یہ بھی ہے کہ ہم مغربی تصورات میں اس حد تک کھو گئے ہیں کہ وہاں کے مروجہ نظامِ جمہوریت کی تنگنائے سے باہر نکل ہی نہیں سکتے جب ہم دیکھتے ہیں کہ اس نظام میں پارٹیوں کا وجود ضروری ہے تو پھر جمہوریت کے مغربی فلسفہ اور اس کے اسلامی تصور کا بنیادی فرق سمجھے بغیر ہم یہ بانگ لگا دیتے ہیں کہ ہمارے ہاں بھی سیاسی پارٹیوں کا وجود اشد ضروری ہے۔ سوچئے کہ یہ کتنا بڑا فریب ہے خود اپنے ساتھ ۔ اور کتنا بڑا کھیل ہے دینِ خداوندی کے ساتھ !

ستم بالائے ستم یہ ہے کہ ان تلخ تجربات کے تباہ کن نتائج ہماری نگاہوں کے سامنے آ چکے ہیں۔ ہمارے ہاں (اور مغرب میں بھی) پارٹیوں کا مسلک و مقصد یہی ہوتا ہے کہ ہر معاملے میں حزبِ اقتدار کی مخالفت کی جائے اور جیسے بھی ممکن ہو برسرِ اقتدار پارٹی کی حکومت کا تختہ الٹ کر اپنی پارٹی کی حکومت قائم کی جائے۔ اس مقصد و مسلک کے لئے ملک کی تمام پارٹیاں ایک دوسرے کے خلاف شب و روز نبرد آزما اور برسرِ پیکار رہتی ہیں اور پوری مملکت میں جنگ و جدل کا جہنم ہر لحظہ بھڑکتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس قسم کا نظام اسلامی تصورِ مملکت میں کبھی بار نہیں پا سکتا۔ ہم نے یہ جہنم بھڑکا کے دیکھ لیا۔ اس کے شعلوں میں پوری ملت کا امن و چین بھسم ہو کر رہ گیا ہے۔ تقلیدِ مغرب کی اس خود فریبی میں ہمیں بدترین ایام دیکھنے پڑے لیکن وائے بر حال ما کہ ہم اس سے ادنیٰ عبرت حاصل نہ کر سکے اور جونہی موقع ملا ماضی کے تلخ تجربات کو ایک بار پھر دہرانے کے لئے تازہ دم میدان میں نکل آئے ۔

ایک بار پھر سن لیجئے کہ اسلامی مملکت کے نظام کی بنیاد وحدتِ ملت پر ہے۔ اس نظام میں نہ تو کسی ایک پارٹی کی حکومت کی گنجائش ہوتی ہے اور نہ کسی دوسرے کی نگرانی اور احتساب کا سوال۔ حکومت کا قیام پوری ملت کا مشترکہ فریضہ ہوتا ہے اور ہر فردِ مملکت کو اس کی نگرانی کا حق حاصل ہوتا ہے ۔" (اگست ۱۹۶۰ء)

مغربی جمہوریت اور اس کی مشینری ہمارے حالات کے قطعاً سازگار نہیں۔ اس کا مغز اسلام کی تعلیم کے یکسر خلاف

ہے۔ عوام کے فیصلوں کی اطاعت قرآن کریم کی رُو سے شرک ہے اور شرک تذلیلِ انسانیت اور ہلاکت کا موجب۔ طلوعِ اسلام نے اس اصولی اور بنیادی بحث پر علیٰ وجہ البصیرت اپنی رائے پیش کرتے ہوئے کہا :-

"مغربی جمہوریت کی بنیاد اس اصول پر ہے کہ ملک میں اقتدارِ اعلیٰ (SOVEREIGNTY) عوام کو حاصل ہوتا ہے۔ عوام اپنے اس اقتدار کو اپنے نمائندگان کے ذریعے بروئے کار لاتے ہیں اور جو فیصلہ عوام کے نمائندگان کی اکثریت کرے وہ ملک کا قانون قرار پاتا ہے جس کی اطاعت ہر ایک کے لئے لازمی ہوتی ہے۔ اقتدارِ اعلیٰ کے معنی یہ ہیں کہ اس کے اختیارات سے بالا کسی کا اختیار نہیں ہوتا۔ وہ جو جی میں آئے فیصلہ کرے اور جس قسم کا چاہے قانون وضع کرے۔

اقتدارِ اعلیٰ

یہ تصور قرآن کی تعلیم کے خلاف ہے۔ قرآن کی رُو سے اس قسم کا اقتدارِ اعلیٰ کسی انسان کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس کی تعلیم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے کچھ بنیادی اصول اور مستقل اقدار عطا کی ہیں جو قرآن میں محفوظ ہیں۔ ان اصول و اقدار میں کوئی فرد، کوئی ادارہ، کوئی حکومت، کوئی مملکت کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں کر سکتی۔ مملکتِ اسلامی ان اصول و اقدار کو برقرار رکھنے اور انہیں عملاً نافذ کرنے کے لئے وجود میں آتی ہے۔ اس مملکت کو البتہ اس کا اختیار ہوتا ہے کہ ان غیر متبدل اصولوں کی چاردیواری کے اندر رہتے ہوئے اپنے لئے جزئی قوانین مرتب کرے۔ یہ قوانین امت کے باہمی مشورے سے مرتب کئے جاتے ہیں۔ باہمی مشاورت کا اصول بھی قرآن کا مقرر کردہ اور غیر متبدل ہے۔"

ثبات و تغیر کا امتزاج

(جنوری ۱۹۶۷ء)

(باقی آئندہ)

پیشگی خریداری

آپ ایک روپے کی کتاب منگواتے ہیں تو اُس پر کم از کم بارہ آنے ڈاک کے خرچ آجاتے ہیں۔ اگر آپ اپنے آپ کو پیشگی خریداروں کی فہرست میں شامل کریں تو آپ کا یہ سارا خرچ بچ سکتا ہے۔ اس کے لئے صرف اتنا کرنا ہوگا کہ آپ مبلغ ایک سو روپیہ پیشگی جمع کرادیں۔ اس کے بعد آپ جو کتاب طلب فرمائیں گے وہ (بغیر ڈاک خرچ) آپ کو بھیج دی جائیں گی۔ رسالہ طلوعِ اسلام کا چندہ بھی اُسی سے وضع کر لیا جائے گا اور آپ کا حساب باقاعدہ آپ کو بھیج دیا جائے گا۔

ان سہولتوں کے علاوہ آئندہ کنونشن کے موقع پر، جو ماہ نومبر ۱۹۶۷ء کے آخری ہفتہ میں منعقد ہو رہی ہے، ادارہ کی کتابوں پر خصوصی رعایت دی جائے گی۔ جو احباب اس ماہ کی ۳۰ تاریخ تک پیشگی خریداری کی اسکیم میں شامل ہو جائیں گے وہ دُہری رعایت کا فائدہ حاصل کر سکیں گے۔ اس خصوصی رعایت کا اعلان اسی شمارہ میں شائع کیا جا رہا ہے۔

(ناظم ادارہ)

کراچی میں تقریبِ یومِ آزادی

(دو تقاریر)

[بزمِ طلوعِ اسلام کراچی نے مورخہ ۱۸ اگست کو یومِ آزادیٔ پاکستان کا پچیسواں جشن منانے کے لئے ایک تقریب منعقد کی تھی جس میں تلاوتِ قرآنِ کریم اور اس کے مفہوم کے بعد دو مقالات پڑھے گئے جن کے عنوان تھے " آزادی " اور " قومی نظریہ اور طلوعِ اسلام "۔ اس کے بعد محترم پرویز صاحب کا خصوصی خطاب " قائدِ اعظمؒ! آپ کہاں ہیں؟ " نشر کیا گیا۔ مقالات پیشِ خدمتِ قارئین ہیں۔]

—— (۱) ——

آزادی (۱)

جنابِ صدر و معزز سامعینِ کرام!

آج ہم سب یہاں پاکستان کی یومِ آزادی کی پچیسویں سالگرہ کا جشن منانے کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ اس موقعہ پر آج ہمیں اپنا محاسبہ کرنا چاہیئے کہ کارگہِ حیات کا تمام نظم و نسق سعی و عمل پر چل رہا ہے اور یہ دیکھنے کے لیے کہ ساعی و اعمال صحیح نتائج بھی مرتب کر رہے ہیں یا نہیں' ان کا جائزہ لینا نہایت ضروری ہوتا ہے۔ اس کا نام محاسبۂ نفس ہے۔ بزرگ رو یہ نہیں دیکھتا کہ اس نے کس قدر مسافت طے کر لی ہے اور باقی راستہ کتنا رہ گیا ہے' اسے منزل تک پہنچنے کی حتمی امید نہیں رکھنی چاہیئے۔ اس لئے کہ ہو سکتا ہے کسی دوراہے پر وہ غلط موڑ مڑ گیا ہو اور اس کے بعد وہ ہر چند چلا جا رہا ہے لیکن اسے اس کا احساس تک بھی نہ ہو کہ اس کا ہر قدم اسے منزل سے دور سے دور تر کرتا چلا جا رہا ہے۔ محاسبۂ نفس سے قبل محاسبۂ آزادی کرنے کے لئے انسانی تاریخ کے اوراق کو الٹتے جایئے۔ کاغذت وصاتوں۔ اور دھاتوں سے پتھروں۔ حالات سے جھونپڑیوں اور جھونپڑیوں سے غاروں کے دور میں پہنچ جایئے' انسانی تہذیب کے نقشے بدلتے اور اس کے تمدن کے خاکے مختلف ہوتے چلے جائیں گے۔ زبانیں بدلیں گی' خیالات بدلیں گے' طرزِ بود و باش بدلے گا لیکن ان تمام تغیرات میں ایک شے ہر جگہ اور ہر مقام پر مشترک اور غیر متبدل نظر آئے گی۔ اور وہ یہ کہ انسانی شعور نے جب سے آنکھ کھولی ہے اس نے ہمیشہ آزادی کی حمد و ستائش میں لاہوتی نغمے گائے ہیں۔ اس نے مختلف زمانوں میں مختلف خداؤں کو چھوڑا بھی ہے اور مختلف دیوتاؤں کی پوجا بھی کی ہے۔ لیکن اس نے آکاش کی اس دیوی کے حضور بلا تخصیصِ زمان و مکان ہمیشہ سرِ دعا کے

پھول چڑھاتے۔ اور عقیدت کی شمعیں جلاتی ہیں۔ تاریخ کے ان ادوار میں ہمیں خدا تک کے منکر مل جائیں گے لیکن کسی ایک دور میں ایک گروہ نہیں ملے گا جس نے آزادی کی عظمت سے انکار کیا ہو۔ انسانی تاریخ کیا ہے؟ اپنی اپنی آزادی کے تحفظ کی جدوجہد کی مسلسل داستان مختلف ادوار میں ہر دور کے فرعون، ہامان اور قارون نے اس امر کی کوشش کی ہے کہ کمزور انسانوں کے سینے سے آزادی کی تمنا کو مٹا دیا جائے۔ لیکن کمزور و ناتواں انسانوں نے اپنا سب کچھ لٹنا اور مٹنا گوارا کر لیا مگر آزادی کی حسین آرزوؤں کو اپنے دل کے کاشانوں سے کبھی مٹنے نہیں دیا۔ اس نے اس قربان گاہ پہ اپنی عزیز ترین متاعِ حیات تک بھینٹ چڑھا دی لیکن اس کی آن پر کبھی حرف نہیں آنے دیا۔ تاریخ کے ریگ ساحل پہ ان گنت موجیں آئیں اور مختلف نقوشِ زمانہ کو بہا کر ساتھ لے گئیں۔ لیکن اگر کوئی نقش ایسا تھا جو ان کی مسلسل سنگ و تاز کے باوجود کبھی مٹ نہ سکا تو وہ اس بطلِ جلیل کے نام کا نقش تھا جس نے آزادی کے تحفظ کی خاطر جان دے دی۔ یا پھر اس باعثِ ننگِ انسانیت کا جس نے اپنوں کی آزادی کو دوسروں کے ہاتھوں بیچ ڈالا۔ بہر حال دنیا نے ہر قوم کی عظمت کو آزادی کے پیمانوں سے ماپا اور اسی کے معیاروں سے جانچا ہے۔

سامعین کرام! جذبۂ آزادی کے اس محاسبے کے ساتھ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بالآخر آزادی کیا شے ہے جو انسانوں کے لئے اس درجہ مرغوب و مقصود بن چکی ہے۔ اگر آزادی وہی ہے جس کا غلغلہ ہم ان دنوں سن رہے ہیں تو مجھے حیرت ہے کہ انسانوں کو آخر ہو کیا گیا ہے کہ اس نے اس کی خاطر زمین و آسمان کو ایک کر رکھا ہے۔ ہماری قوم گذشتہ پچیس سال سے آزاد ہے اور ہر سال اس آزادی کا جشن مناتی ہے۔ لیکن ہماری حیاتِ اجتماعیہ میں آج تک کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔ ہم وہیں ہیں جہاں اس تاریخ آزادی کے وقت تھے۔ بلکہ شاید اس سے بھی کچھ پیچھے۔ کیا یہی وہ آزادی ہے جس کے نغمے فطرتِ انسانی کے ساز سے ہمیشہ ابھرتے اُبلتے رہے ہیں۔ اگر آزادی اسی کیفیت بلکہ عدم کیفیت کا نام ہے تو ہمیں اعتراف کر لینا چاہیئے کہ یا تو تاریخ کی رصد گاہوں کے تمام نقوش باطل ہیں یا ہم نے کہیں دھوکا کھایا ہے۔

میرے بزرگو! کہنے کو تو ہم آزاد ہیں لیکن ہمیں یہ محسوس ہی نہیں ہوا کہ اس آزادی نے ہم میں کون سی تبدیلی پیدا کی ہے جس کے باعث ہم اس آزادی کی زندگی کو سابقہ غلامی کی زندگی پر ترجیح دیں۔ موجودہ جمود سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ بظاہر اس آئینی آزادی میں کسی ایسی شے کی کمی ہے جس سے آزادی اور غلامی میں چنداں امتیاز نظر نہیں آتا۔ آیئے دیکھیں کہ سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے ـــــ کے مصداق کون ـــــ تو ـــــ ہم میں نہیں۔ آیئے دیکھیں کہ اس ہیملٹ کی داستان میں وہ کون سا شہزادہ گم ہے جس سے یہ داستان اس درجہ بے کیف ہو کر رہ گئی ہے۔

معزز حاضرین! علامہ اقبالؒ نے فرمایا تھا۔ "قومیں فکر سے محروم ہو کر برباد ہو جاتی ہیں"۔ ہماری بھی آج یہی حالت ہے۔ ہم سیاسی آزادی سے تو ہم کنار ہو چکے ہیں لیکن فکر سے محروم اور تہی ہیں۔ آزادی غیر کی غلامی کی عدم موجودگی کی سلبی کیفیت کا نام نہیں۔ آزادی مثبت شے ہے۔ یہ لَا اِلٰہ کی وادی میں حاصل نہیں ہوتی بلکہ گلستانِ اِلَّا اللہ کی دائمی بہار ہے۔ آزادی ظلمت نہیں کہ عدمِ نور کا نام ہو، بلکہ یہ نور کی مثبت موجودگی ہے کہ جس سے زندگی کا ہر گوشہ منور اور درخشاں ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آزادی خارج سے مسلط نہیں کی جا سکتی بلکہ اس کا فوارہ اعماقِ قلوب سے پھوٹتا ہے۔ یہ اس وقت تک مثبت کیفیت نہیں بنتی جب تک کہ مَا بِاَنْفُسِهِمْ کے تغیر و تبدل کی آئینہ دار نہ ہو۔

اِس محرومیٔ فکر کا نتیجہ ہے کہ عوام کے تحت الشعور میں ایک خلش ہے۔ مبہم خلش جس کا علاج اسے میسر نہیں۔ وہ دنیاوی حکومت قائم کرتا ہے تو اس کا ضمیر اُسے ملامت کرتا ہے کہ پاکستان کو اس نے اسلامی نظام رائج کرنے کیلئے حاصل کیا تھا۔ اگر اسلامی نظام رائج کرنے کی طرف آتا ہے تو اُسے معلوم نہیں ہوتا کہ اُسے کیا کرنا ہے۔ پوری قوم ذہنی انتشار میں مبتلا ہے۔ اسلامی نظام کا خواب کثرتِ تعبیر سے پریشان ہو رہا ہے۔ ماضی کے مخصوص حالات نے مُلّا کو مذہب کا خصوصی اجارہ دار بنا دیا ہے۔ مُلّا اسلام کا جو تصور پیش کرتا ہے وہ رجعت پسندانہ، دقیانوسی اور ناقابلِ قبول و عمل ہے۔ غیر مذہبی امور کے لئے دنیاوی حکومت لازمی ہے۔ دنیاوی حکومت کی زمام مغرب زدہ ہاتھوں میں رہی ہے۔ ان کا مغربی تصورِ اجتماعیت و حکومت مسلمانوں کے مزاجِ قومی کے مطابق نہیں۔ اربابِ حکومت مغربی فضا کے تربیت یافتہ ہونے کی حیثیت سے معذور ہیں، وہ صرف مغرب کا نظام رائج کر سکتے ہیں۔ اور عوام کا تقاضا اور ان کی طلب اس سے یکسر مختلف ہے۔

اِس عدمِ اعتماد اور منافقت کے گرداب سے قوم اُسی وقت نکل سکتی ہے جب اس میں جراتِ افکار اور قوتِ تخلیق کی نمود کی جائے۔ تاکہ وہ قرآنی نظامِ حیات کو اپنی زندگی کا نصب العین بنانے پر آمادہ ہو جائے کیونکہ یہی وہ واحد نظامِ زندگی ہے جس کی بنیاد اس حقیقتِ کبریٰ پر ہے کہ کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے انسان پر حکومت کرے۔ اس اصل الاصول میں احترامِ آدمیت اور حقیقی آزادی کا راز پوشیدہ ہے

معزز سامعین! یہ ہماری خوش بختی ہے کہ ہمارے ملک میں ایک ایسا صاحبِ فکر موجود ہے جس کے سینے میں قرآن کریم کی تڑپ موجزن ہے اور ایسی تحریک بھی موجود ہے جس کی بنیاد خالصتہً قرآنی فکر پر استوار کی گئی ہے۔ اسی کے ذریعے ایسا نظام متعین ہو سکتا ہے جس میں ہر ایک کو صحیح اطمینان حاصل ہو جائے اور ملت اس نورِ ربانی کی روشنی میں اپنی منزلِ صحیحہ کی جانب گامزن ہو سکے۔ اگر ایسا ہوا تو پھر وہ حقیقی آزادی میسر آسکے گی جس کے بغیر ہماری موجودہ آزادی ایک بادۂ بے کیف ایک جسدِ بے روح ہے۔ اس کے بغیر ہم آئینی آزادی سے تو شاید ہمکنار رہ سکیں اس حقیقی آزادی کو کبھی پا نہیں سکیں گے جو ان بے شمار اطواق و سلاسل کو توڑتی ہے جو انسان نے خود بُن رکھے ہیں۔ آزادی کے یوم ہر سال آئینگے اور گذر جائیں گے۔ ہم خوشیاں بھی منائیں گے لیکن اس آنجوانی خوری سے کچھ نفع نہیں ہوگا جب تک ہم مغز تک نہ پہنچیں۔

(شاہینہ اسلام)

~~~~~~ (۱) ~~~~~~

"دو قومی نظریہ اور طلوعِ اسلام" (۲)

صدرِ گرامی قدر اور معزز سامعین!

یہ ساعت کس قدر سعید اور یہ لمحۂ زندگی کیسا درخورِ ہزار تبریک ہے کہ تشکیلِ پاکستان کے بعد طلوعِ اسلام اپنی زندگی کے پچیس سال پورے کر چکا ہے۔ اس مدت میں مفکرِ قرآن جناب محترم پرویز صاحب نے اس تحریک
~~~~~~

کی وساطت سے خزینۂ ملی کو بصیرتِ قرآن کے جو گوہر ہائے آبدار عطا کئے ہیں اُن میں دو قومی نظریہ نمایاں حیثیت رکھتا ہے لیکن اس نظریہ کو سمجھنے کے لئے یہ جاننا اشد ضروری ہے کہ قرآن کی رُو سے انسان کی زندگی محض طبعی زندگی نہیں، اس میں حیاتِ طبعی کے علاوہ ایک اور شے بھی ہے جسے انسانی ذات کہا جاتا ہے۔ انسان کے ہر عمل کا اثر اس کی ذات پر پڑتا ہے اور انسان کی طبعی موت کے ساتھ اس کی ذات کا خاتمہ نہیں ہو جاتا۔ اس کی ذات ان اثرات کو لئے ہوئے جو اس پر مرتب ہوتے رہتے ہیں مرنے کے بعد آگے بڑھتی ہے اور جس قسم کے اثرات کا مجموعی پلڑا بھاری ہو اس کے مطابق اس کا مستقبل متشکل ہوتا ہے۔ اس نظریۂ زندگی کا نام دین ہے۔

دینِ خداوندی کی رُو سے دنیا میں صرف دو قومیں ہیں۔ ایک وہ جو خدا کی متعین کردہ زندگی کی بلند اور غیر متبدل اقدار کی صداقت پر ایمان رکھیں۔ انہیں مومن کہا جائے گا اور دوسری وہ جو ان اقدار سے انکار کریں۔ انہیں کافر کہہ کر پکارا جائے گا۔ ھو الذی خلقکم۔ خدا نے تم سب کو صرف انسانوں کی حیثیت سے پیدا کیا۔ اس کے بعد فمنکم کافر و منکم مومن۔ تم دو قوموں میں بٹ گئے۔ ایک جماعتِ مومنین اور ایک گروہ کفار۔ اس کے علاوہ انسانوں کی کوئی اور تقسیم نہیں۔ انسانوں کو صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا کیا گیا ہے۔ اس لئے کوئی ایسی تفریق و تخصیص جس میں اس کے اختیار و ارادہ کو دخل نہ ہو انسانی عمل نہ سمجھا جائے گا۔ اگر قومیت کا معیار نسل ہے تو جو شخص کسی ایک نسل میں پیدا ہو گیا وہ اپنی نسل اور لہٰذا قومیت بدل نہیں سکتا۔ اگر معیار وطن ہے تو کسی خاص ملک میں پیدا ہو جانا بھی پیدا ہونے والے بچہ کے اختیار میں نہیں ہوتا لیکن کفر و ایمان ہر فرد کے اپنے اختیار و انتخاب کی چیز ہے۔ فمن شآء فلیؤمن و من شآء فلیکفر۔ جس کا جی چاہے ایمان لا کر قومِ مومنین میں شامل ہو جائے جس کا جی چاہے کفر کی روش اختیار کر کے گروہِ کفار میں شامل ہو جائے۔ راستے یہ دو ہی ہیں، تیسرا راستہ کوئی نہیں لہٰذا قومیں بھی دنیا میں دو ہی ہیں۔ ایک حزب اللہ یعنی خدا کی پارٹی اور دوسرے حزب الشیطان یعنی غیر از خدا کی پارٹی۔

جہاں تک حزب الشیطان کے اجتماعی نظام کا تعلق ہے اس میں انسانوں کی وضع کردہ سیاست کا مسلک یہ ہے کہ اس کے لئے کوئی اصول، کوئی قدر غیر متبدل نہیں۔ ہر قوم ہر وقت اپنے سیاسی مفاد اور معاشی مصالح کے پیشِ نظر جو مسلک جی چاہے اختیار کرلے۔ اسے دورِ حاضر کی اصطلاح میں سیکولر نظامِ حکومت کہا جاتا ہے۔ اس نظام میں مختلف افراد کو مذہبی عقاید و رسوم کی آزادی حاصل ہوتی ہے لیکن ان عقاید کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں۔

اس کے برعکس قرآن مجید نے یہ تصور پیش کیا کہ جس طرح فطرت کے قوانین اٹل اور غیر متبدل ہیں اسی طرح انسانی زندگی کے لئے بھی کچھ غیر متبدل اصول و قوانین ہیں جو انسان کو وحی کے ذریعہ ملے ہیں اور جو قرآن مجید کے اندر محفوظ ہیں۔ جماعتِ مومنین کے نظامِ حکومت پر ان اصول و اقدار کی پابندی لازم ہے۔ وہ کسی صورت میں بھی ان سے انحراف نہیں برت سکتے۔

اسی حقیقت کو ان الفاظ میں بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ اسلام مذہب نہیں دین ہے۔ اور دین پر اسی صورت میں عمل کیا جا سکتا ہے جب اُمتِ مسلمہ کی اپنی آزاد مملکت ہو جس کا کاروبارِ حکومت مستقل اقدار و اصولِ خداوندی کے تابع ہے لہٰذا اپنی آزاد مملکت کے بغیر اسلامی زندگی بسر کرنے کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔

اسلام کے صدرِ اوّل میں ان دونوں بنیادی اصولوں پر عمل کیا گیا۔ حضور نبی کریم نے پہلے ایک ایسی امت کی تشکیل فرمائی جس کی وجہ جامعیت نظریۂ زندگی یعنی ایمان کا اشتراک تھا اور پھر اس امت سے اپنی مملکت قائم کی، جس میں قرآنی اقدار و اصولِ حیات کے مطابق حکومت قائم کی گئی اسے اسلامی نظامِ حکومت کہا جاتا ہے۔ اس نظام میں جو انسانیت ساز نتائج پیدا کئے، تاریخ کے اوراق ان کی زندہ اور درخشندہ شہادت ہیں۔

کچھ عرصہ کے بعد مسلمانوں کے اپنے تغافل، تساہل اور تکاسل کی وجہ سے اسلامی نظام باقی نہ رہا اور اس کی جگہ نظامِ ملوکیت نے لے لی۔ اس نظام میں امورِ سیاست مسلمان بادشاہوں نے اپنے ہاتھ میں رکھے اور مذہبی عقائد و رسوم کا دائرہ مذہبی پیشوائیت کے حیطۂ اختیار میں دے دیا۔ یوں دین سے سیاست الگ ہو گئی اور ایک ایسا سیکولر نظام رائج ہو گیا جس کا لازمی نتیجہ سرمایہ داری تھا۔ یہ سلسلہ صدیوں سے چلا آرہا تھا اور تمام اسلامی ممالک میں جاری و ساری تھا کہ سرسیدؒ کے بعد بیسویں صدی کے اوائل میں علامہ اقبالؒ نے اس کے خلاف آواز اٹھائی اور اپنے دم واپسیں تک اس جہاد کو جاری رکھا اور جب ملک کی فکری و شعوری فضا ہموار ہو گئی تو ۱۹۳۰ء میں الٰہ آباد کے مقام پر مسلم لیگ کے جلسہ کے خطبۂ صدارت میں انہوں نے کہا کہ —— ہندوستان میں بسنے والے مسلم اور غیر مسلم اشتراکِ وطن کی بنا پر ایک قوم کے افراد نہیں۔ مسلمان فی ذاتہٖ ایک الگ قوم ہیں۔

مسلمان اسلام کے مطابق اسی صورت میں زندگی بسر کر سکتے ہیں جب ان کی اپنی آزاد مملکت ہو جس میں یہ قرآنی اصول و اقدار کو حکومت کے قوانین کی حیثیت سے نافذ کر سکیں۔ ان دونوں شقوں کے مجموعے کو نظریۂ پاکستان کہا جاتا ہے۔ اور اس مطالبہ کو عملی شکل دینے کے لئے قائدِاعظمؒ نے علم اٹھایا تو اس تحریک کی مخالفت ہندو، انگریز اور خود مسلمانوں کی طرف سے ہوئی۔

گاندھی جی نے اپنی ۱۴ اپریل ۱۹۴۷ء کی ایک تقریر میں کہا تھا کہ

"میری روح اس امر سے بغاوت کرتی ہے کہ اسلام اور ہندو مت دو مختلف اور متضاد کلچر اور نظریۂ حیات ہیں کسی ایسے نظریہ کا تسلیم کر لینا میرے نزدیک خدا کے انکار کے مرادف ہے۔ میں اس نظریہ کے خلاف یقیناً بغاوت کروں گا کہ وہ لاکھوں مسلمان جو ابھی کل تک ہندو تھے اسلام قبول کر کے اپنی قومیت بھی بدل بیٹھیں۔"

اور انگریزوں کی مخالفت کی وجہ یہ تھی کہ انہیں اس کا خطرہ تھا کہ اگر دنیا کے کسی خطہ میں بھی قرآنی نظام قائم ہو گیا تو اس کے سامنے ان کا امپیریلزم اور کیپٹلزم پر مبنی نظام ٹھہر نہ سکے گا۔

لیکن اس تحریک کی کہیں زیادہ شدید مخالفت مسلمانوں کے ایک اور گوشہ کی طرف سے ہوئی اور یہ تھا علمائے کرام کا گوشہ۔ آپ کو آج اس پر یقیناً حیرت ہو گی کہ وہ کون سا مسلمان ہو سکتا تھا جو اس نظریہ کو خلافِ اسلام قرار دے کہ مسلمان ایک آزاد خطہ میں اسلامی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں جہاں زندگی قرآن کریم کے اصولوں کے سانچے میں ڈھل سکے لیکن اس نظریہ کی مخالفت ہوئی اور سخت مخالفت۔ اور یہ مخالفت کرنے والی جمعیت العلمائے ہند جس کے سرغنہ مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی، مفتی کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید وغیرہ علمائے کرام تھے۔ بہار میں اس کی مخالفت الضمار، پنجاب میں مجلس احرار اور سرحد میں سرخپوش۔ یہ سب اسی مطالبہ کے خلاف تھے کہ مسلمان اپنی آزاد حکومت قائم کریں جس میں طرزِ زندگی اسلامی قالب میں ڈھل جائے۔ وہ صرف اس لئے کہ ان

سے پیشوائیت کا خاتمہ ہو جائے۔

اس مخالفت کی روک تھام کے لئے قرعۂ فال محترم پرویز صاحب کے نام پر پڑا جو اُن کے الفاظ میں "۱۹۳۸ء کے پاکستانی" تھے۔ اس مقصد کیلئے ۱۹۳۸ء میں طلوعِ اسلام کا اجرا ہوا۔ اس نے مذہب کے نام پر تحریکِ پاکستان کی مخالفت کرنیوالوں کے خلاف جوش و خروش اور ثبات و استقامت کے ساتھ سخت لڑائی لڑی اور بتایا کہ مسلم قومیت کا معیار اشتراکِ دین ہے نہ کہ نسل، رنگ، زبان یا وطن کا اشتراک۔ جو لوگ دین میں مشترک (مسلمان) ہیں وہ دنیا کے کسی خطہ میں بستے ہوں کسی نسل سے تعلق ہوں، کوئی زبان بولتے ہوں وہ سب ایک قوم کے افراد ہیں۔ اس کے برعکس اگر وہ ایک ہی ملک میں بستے ہوں اور ایک ہی نسل کیا بلکہ ایک ہی خاندان سے ہی متعلق کیوں نہ ہوں، اگر وہ دین میں مشترک نہیں تو وہ دو الگ الگ قوموں کے افراد ہیں۔ فارس کا سلمانؓ۔ روم کا صہیبؓ۔ حبشہ کا بلالؓ۔ عرب کا عمرؓ۔ نسل، رنگ، زبان اور وطن کے اختلاف کے باوجود محض دین کے اشتراک کی بنا پر ایک قوم کے افراد تھے لیکن محمد رسول اللہ اور حضورؐ کے حقیقی چچا ابولہب دو الگ الگ قومیتیں رکھتے تھے۔

اسی دو قومی نظریہ کو مدِنظر رکھتے ہوئے قائداعظمؒ نے مسلمانوں کے لئے ایک آزاد مملکت حاصل کرنے کی انتھک کوشش کی جس کے نتیجہ میں ہندو، انگریز اور خود مسلمانوں کے اس جمِ غفیر کی مخالفت کے علی الرغم ۱۹۴۷ء میں پاکستان وجود میں آگیا لیکن پاکستان بننے کے ساتھ ہی ہم نے اس نظریہ کو بالائے طاق رکھ دیا اور پاکستانی مسلمانوں اور غیرمسلموں کو ایک قوم تسلیم کر لیا نیز یہ کہ پاکستان میں دین کی تعلیم کو نظرانداز کر کے غیر اسلامی تفریق و تمیز کو پٹھان، پنجابی، سندھی، بلوچی، بنگالی کہہ کر برقرار رکھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پاکستان میں بسنے والے مسلمانوں نے کلمہ لا الٰہ الا اللہ جو دو قومی نظریہ کی بنیاد تھا فراموش کر دیا اور اسی نظریہ کی تکذیب سے مشرقی پاکستان، پاکستان سے الگ ہو گیا اور اب مغربی پاکستان میں چار پانچ قومیتوں کے جراثیم پرورش پا رہے ہیں۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ،

نوجوانوں کے دلوں میں دو قومی نظریہ کی اہمیت اس طرح واضح کی جائے کہ وہ یہ ذہن نشین کر لیں کہ اسی نظریہ کی بنا پر پاکستان وجود میں آیا تھا اور اس کا منتہائے مقصود یہ تھا کہ اس خطۂ ارضی میں قرآن کے اصول و اقدار کی حکمرانی ہو تاکہ انسانیت فوز و فلاح کی منزل پر گامزن ہو۔ اس کے لئے ہمیں اپنی قوم کا نظامِ تعلیم بدلنا ہوگا اور قرآنی تصورِ حیات سے واضح کرنا ہوگا کہ اسلام کا نظریۂ قومیت کیا ہے؟ اور یہ نظریہ کس طرح اسلامی مملکت کی بنیاد قرار پا سکتا ہے۔ ان نظریات کو چھوڑ کر نہ کوئی فرد مسلمان ہو سکتا ہے اور نہ کوئی مملکت اسلامی کہلانے کی مستحق۔ جو بچے ان تصورات کو لے کر بڑے ہوں گے وہ اس قابل ہوں گے کہ نسلی، لسانی، علاقائی، وطنی حدود سے بلند ہو کر خالص اسلامی نظریہ کی بنیاد پر ایک قوم متشکل کر سکیں۔ یہی نوجوان مملکتِ پاکستان کے جداگانہ وجود کی اہمیت کو سمجھیں گے اور یہی اس کے استحکام و بقا کے لئے ہر قربانی دینے کے لئے ہر وقت آمادہ ہو سکیں گے پھر انہیں نہ کوئی ہندو خرید سکیگا اور نہ ہی کوئی ازم ورغلا سکے گی۔ یہ ہے دو قومی نظریہ کے متعلق طلوعِ اسلام کا موقف جس کے لئے اس نے ۱۹۳۸ء سے اپنی جدوجہد کا آغاز کیا اور مسلسل اپنی روشنی تاریکیوں میں پھیلاتے جا رہا ہے۔

(خواجہ محمد ظاہر)

طلوعِ اسلام کی پندرھویں (۱۵) سالانہ کنونشن

۱۔ امسال ۲۳ تا ۲۶ نومبر ۱۹۷۲ء (بروز جمعرات، جمعہ، ہفتہ، اتوار) حسب سابق، بمقام ۲۵۔ بی، گلبرگ ۲، لاہور منعقد ہو رہی ہے۔ جیسا کہ قارئین کو معلوم ہے، تحریک طلوع اسلام کا تعلق نہ کسی سیاسی پارٹی سے ہے نہ مذہبی فرقہ سے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ زندگی کے عملی مسائل سے متعلق جو راہنمائی قرآن مجید سے ملے اسے (بغیر کسی ہنگامہ آرائی اور تفرقہ انگیزی کے)، اس طرح عام کیا جائے کہ ارباب فکر و نظر قرآنی نہج پر سوچنے کے عادی ہو جائیں اور اس طرح قوم کے قلب و دماغ میں ایسی خوشگوار تبدیلی واقع ہو جائے جس سے یہاں صحیح اسلامی معاشرہ متشکل ہو جائے۔

۲۔ کنونشن کے کچھ اجلاس تو مندوبین تک محدود ہوتے ہیں اور کچھ ایسے جن میں عام احباب بھی سامعین کی حیثیت سے شریک ہو سکتے ہیں۔ ان کھلے اجلاس میں محترم پرویز صاحب کے بصیرت افروز و حقیقت کشا خطابات مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس وقت ملک جس بحران سے گذر رہا ہے اور قوم کو جس شدت سے قرآنی راہ نمائی کی ضرورت ہے اس کے پیش نظر اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ امسال ان خطابات کے موضوع کس قدر اہم ہوں گے۔

۳۔ کنونشن کی ایک خاص نشست اس مذاکرہ کے لئے مختص ہوتی ہے جس میں قوم کا نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ (بالخصوص طلباء و طالبات) حصہ لیتے ہیں۔ امسال مذاکرہ کا عنوان ہے۔

ہو فکر اگر خام تو آزادیٔ افکار
انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ (اقبالؒ)

۴۔ ایک شب مجلسِ استفسارات آراستہ ہوتی ہے جس میں مفکر قرآن محترم پرویز صاحب مستفسرین کے سوالات کا جواب اپنے مخصوص، وسیع و عمیق اور شگفتہ و شاداب انداز میں دیتے ہیں۔

۵۔ مندرجہ بالا پروگرام مختصر ہے۔ حتمی پروگرام وسط نومبر تک شائع ہو سکیگا۔

ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام
۲۵۔ بی، گلبرگ ۲، لاہور

ادارۂ طلوع اسلام کی

کتابوں کی قیمت میں خصوصی رعایت

ادارۂ طلوع اسلام ہر سال کنونشن کی تقریب پر اپنی شائع کردہ کتابوں کی قیمت میں خصوصی رعایت دیا کرتا ہے۔ یہ رعایت ان کتابوں پر امسال بھی دی جائے گی جن کی فہرست درج ذیل ہے بشرطیکہ جو کتابیں مطلوب ہوں اُن کی قیمت بذریعہ منی آرڈر ۳۰ نومبر تک موصول ہو جائے۔ اس کے بعد وہ کتابیں بذریعہ ڈاک بھیجدی جائیں گی اور خرچ ڈاک وی پی کے ذریعے وصول کیا جائیگا۔ کنونشن کے موقعہ پر پنڈال کے ساتھ بک سٹال قائم کر دیا جائے گا۔ دستی کتابیں انہی قیمتوں پر وہاں سے بھی خریدی جا سکینگی۔

فہرست کتب جن پر رعایت دی جائیگی

نام کتاب	اصل قیمت	رعایتی قیمت	نام کتاب	اصل قیمت	رعایتی قیمت
مفہوم القرآن (مکمل سیٹ)	۸۰/-	۷۰/-	سلیم کے نام (مکمل سیٹ)	۲۶/-	۱۴/-
لغات القرآن (مکمل سیٹ)	۶۰/-	۵۰/-	پاکستان کا معمار اول	۳/-	۲/-
اسلام کیا ہے (اعلیٰ ایڈیشن)	۱۰/-	۸/-	انسانیت کا آخری سہارا	۱/-	-/۵۰
اسلام کیا ہے (سستا ایڈیشن)	۶/-	۵/-	عالمگیر اخوت	۱/-	-/۵۰
انسان نے کیا سوچا	۱۵/-	۱۰/-	منشور آزادی	۱/-	-/۵۰
فردوس گم گشتہ	۱۰/-	۶/-	فجر الاسلام اول	۴/-	۲/-
دھتکارے ہوئے انسان	۵/-	۳/-	فجر الاسلام دوم	۴/-	۲/-
معراج انسانیت	۲۰/-	۱۴/-	اسلام پر کیا گذری	۵/-	۳/-
سلسبیل	۱۰/-	۶/-	ISLAM, A CHALLENGE TO RELIGION (R.B)	۲۰/-	۱۵/-
مقام حدیث	۵/-	۴/-	جہان فردا (سستا)	۸/-	۶/-
اسباب زوال امت (اعلیٰ)	۱/۵۰	۱/-	تاریخ الامت (مکمل سیٹ)	۲۵/-	۱۵/-
اسباب زوال امت (سستا)	۱/-	-/۲۵	تمثیل عزیز، غلام اور لونڈیاں	۲/-	۱/-
جہاد	۲/-	۱/۵۰	دستور پاکستان	۲/۵۰	۱/-
قرآنی قوانین	۴/-	۳/-	PRINCIPLES OF LAW MAKING IN ISLAM	۲/-	۱/-
قرآنی فیصلے (جلد دوم)	۵/-	۴/-	منزل بہ منزل	۶/-	۳/-
قرآنی فیصلے (جلد سوم)	۵/-	۴/-	قرآنی فیصلے (جلد اول) (دوسرا ایڈیشن)	۵/-	۴/-
طاہرہ کے نام خطوط (تازہ ایڈیشن)	۶/-	۵/-	قائد اعظم کے تصور کا پاکستان	۱۰/-	۸/-
اسلامی معاشرت (تازہ ایڈیشن)	۴/-	۳/-			

(ناظم ادارہ طلوع اسلام)